ماہنامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الشمس

دسمبر ۸۱

سوال و جواب

۷ محرم ۱۴۰۲

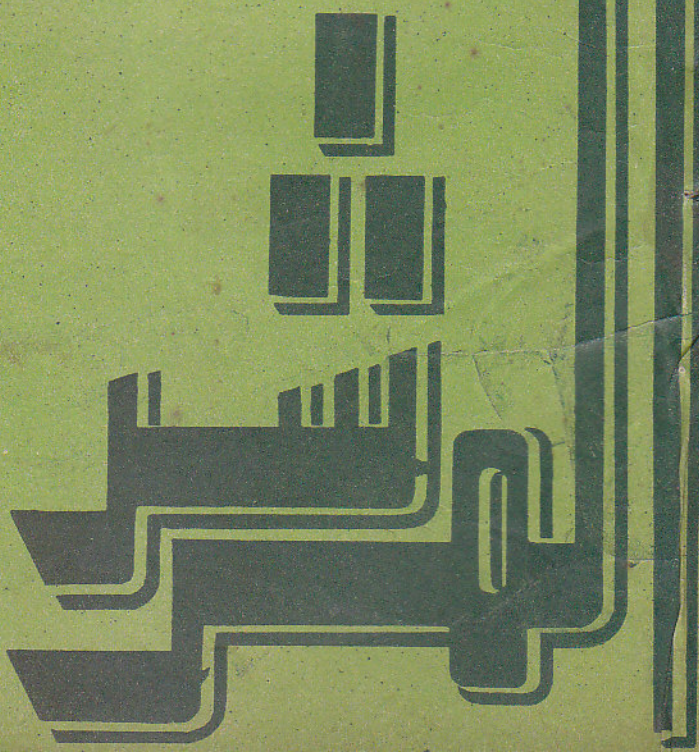

دینی، اصلاحی اور علم سلوک وتصوف کا واحد مجلہ

ماہنامہ المرشد چکوال (جہلم)

جلد ۳ | محرم الحرام ۱۴۰۲ھ | شمارہ ۱

دسمبر ۱۹۸۱ء

• سرپرست اعلیٰ

حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب دامت برکاتہم

• مدیر مسئول

پروفیسر حافظ عبدالرزاق ایم اے عربی اسلامیات

• مجلس ادارت (اعزازی)

پروفیسر بنیاد حسین نقوی بی اے (آنرز)، ایم اے

ملک محمد اکرم صاحب مدظلہ العالی (سنارہ ضلع جہلم)

پروفیسر باغ حسین کمال ایم اے

بدل اشتراک

زر سالانہ ۳۵ روپے

ششماہی ۱۸ "

فی کاپی

۳ روپے

حافظ عبدالرزاق پرنٹر پبلشر و مدیر مسئول ماہنامہ المرشد چکوال ضلع جہلم نے با اہتمام جناب منہاج الدین اصلاحی شرکت پرنٹنگ پریس نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ المرشد الحسنات منزل چکوال سے شائع کیا

سول ایجنٹ: مدنی کتب خانہ گنپت روڈ لاہور

اس شمارہ میں

• ۔ اداریہ	مدیر
• ۔ اسرار التنزیل	حضرت مولانا محمد اکرم صاحب
• ۔ چراغ مصطفوی	پروفیسر حافظ عبدالرزاق صاحب ایم اے
• ۔ ایک خط	
• ۔ جواب خط	
• ۔ اللہ کے نزدیک	معارف القرآن
• ۔ صحبتے با اہل دل	کمالاتِ اشرفیہ
• ۔ واتبع سبیل من اناب	ابو سعید ایم اے
• ۔ تعمیر سیرت	حافظ عبدالرزاق صاحب ایم اے
•	پروگرام مجلس ذکر
• خدایا ایں کرم بارِ دگر کن	حافظ عبدالرزاق صاحب ایم اے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ "المرشد" کی زندگی کے دو سال پورے ہو گئے۔ اب تیسرے برس کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس عرصہ میں اپنی ہمہ پہلو کم مائیگی کے باوجود "المرشد" نے اہلِ ایمان اور اہل دل کی جس قدر خدمت کی اس کا تصور کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ

ع قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت اُستاد مکرم کے اس چشمۂ فیض کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھے۔

محرم کا مہینہ قمری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ سال کے مختلف مہینوں، ہفتے کے مختلف دنوں اور دن کے مختلف اوقات کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو افعال و اعمال وابستہ کر دئے ہیں وہ دین کا حصہ ہیں اور ان کا مجموعہ اصل دین ہے اور ماوشما نے اپنی پسند سے ان کے ساتھ جو اضافے کر دیئے ہیں وہ کیسے ہی پر لطف کیوں نہ ہوں ان کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ دین نام ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور پسند کا۔ اس دائرے سے باہر جو کچھ ہے وہ دین نہیں اس کا جو نام چاہو رکھ لو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہود کو عاشورہ یعنی دسویں محرم کا روزہ رکھتے ہوئے پایا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا یہ کیا دن ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا یہ بڑا دن ہے اس میں اللہ تعالےٰ نے موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی۔ تو حضرت موسیٰؑ نے اس دن کا روزہ بطور شکر کے رکھا۔ اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری نسبت موسیٰؑ کے ہم زیادہ قریب ہیں۔ پھر حضورؐ نے اس دن روزہ رکھا اور دوسروں کو اس روزہ کا حکم دیا (متفق علیہ)

صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ سب روزوں سے افضل رمضان کے بعد اللہ تعالےٰ کا مہینہ محرم ہے یعنی اس کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھنا رمضان کے سوا اور سب روزوں سے زیادہ ثواب رکھتا ہے حدیث میں مزید یہ ملتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ یہود کی مخالفت کرو اور نویں دسویں محرم یعنی دو روزے رکھو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکہ مکرمہ میں آپؐ کی زوجہ محترمہ اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا انتقال ہوا۔ مدینہ منورہ میں آپکے عزیز چچا

سیدالشہدا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت ہوئی - آپ کی تین بیٹیاں فوت ہوئیں - آپ کے بیٹے فوت ہوئے - مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کی وفات کی تاریخ کو تقریب کے طور پر کبھی نہیں منایا اگر ایسا کرنا ضروری ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور یہ کرتے اور اُمت آپ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرتی - مومن کے لئے فلاح دارین کا راز حضور اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی ہے -

اللہ تعالےٰ دین کا فہم عطا فرمائے آمین

مدیر

● :- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں خاص برکت کا راز یہ ہے کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیئت بناتا ہے اس پر اللہ تعالےٰ کو محبت اور پیار آتا ہے کہ یہ میرے محبوب کا ہم شکل ہے - پس یہ وصول کا سب سے اقرب طریق ہے

(ا - ع - ت)

گذشتہ سے پیوستہ

مولانا محمد اکرم صاحب مدظلہ

اسرار التنزیل

ذکر پاس انفاس پوری قوت سے کرنے کی بات ہو رہی تھی کہ جب تک قلب کا تعلق اللہ رب العزت سے قائم نہ ہو اور وجود میں ایک خاص کیفیت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے کام نہیں بنتا اور اس کے لئے خون میں ایک خاص درجے کی حدت کا پیدا ہونا ضروری ہے تاکہ قلب میں استعداد قبول پیدا ہو۔ اس سلسلے میں ایک بنیادی حقیقت ذہن میں رکھیئے کہ تعلق باللہ قرب الی اللہ اور منازل سلوک میں ترقی کے لئے اللہ اور بندے کے درمیان ایک ناگزیر واسطہ ہے اور وہ ہے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقی قلبی تعلق تاکہ اخذ فیض اور جذب انوار کی صورت پیدا ہو سکے پھر یہ دیکھنا ہے کہ یہ انوار کہاں سے آتے ہیں اور سالک کے قلب میں کیونکر جذب ہوتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مکلف مخلوق کے لئے دو طرح سے واسطہ اور ذریعہ ہے اول آپ کی ذات گرامی پر دل سے ایمان لانے سے ایک خاص تعلق حضورؐ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے نور بصیرت عطا فرمائے اسے یہ تعلق یوں نظر آتا ہے کہ نور کی ایک نہایت باریک تار حضور اکرمؐ کے قلب طہر سے اس کے قلب تک آ رہی ہے۔ یہ تعلق ایمان کا ہے۔ اگر اس واسطہ پر ایمان نہ ہو تو اللہ پر ایمان ہونا ممکن ہی نہیں۔ فقہا یہاں تک لکھتے ہیں کہ جب بچے کو یہ سکھایا جائے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں وہ میرا خالق، مالک اور معبود ہے تو لازماً یہ بھی سکھایا جائے کہ میں اس اللہ کو مانتا ہوں جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر مکہ مکرمہ میں مبعوث فرمایا جو ہجرت کر کے مدینہ طیبہ گئے اور جو اللہ کے آخری رسول ہیں اور میں اس اللہ کو اس طرح مانتا ہوں جس طرح آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو ماننے کی تعلیم دی۔ ورنہ یوں تو لوگوں نے اللہ کو ماننے کی مختلف صورتیں از خود بنا رکھی ہیں لیکن اس صورت کے علاوہ اللہ کو ماننے کی کوئی صورت عند اللہ قابل قبول نہیں۔ جو تعلق باللہ

کے لئے یہی ایمان بنیاد بنتا ہے یہی نورِ ایمان ایک مومن حضورِ اکرمؐ کے قلبِ اطہر سے اخذ کرتا ہے یہی وجہ ہے قرآن کریم اعلان کرواتا ہے قُلْ لَّا تُؤْمِنُوا یعنی آپ ان دیہاتیوں سے کہہ دیں کہ تم ایمان نہیں لائے ولکن قُولُوا اَسْلَمْنَا لیکن یہ کہو کہ ہم نے بات مان لی کیونکہ وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِی قُلُوبِکُمْ ایمان ابھی تمہارے دل کی گہرائیوں میں پیوست نہیں ہوا۔ جب تک نورِ ایمان کی کوئی کرن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر سے آدمی کے دل میں نہ آئے، یقین پیدا نہیں ہو سکتا ضابطے کی کاروائی کے طور پر مان لینا اور بات ہے۔

اب اس نور کے قیام اور ترقی کا سبب اعمال ہیں اگر اعمال حضور اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق ہیں اتباعِ نبوی میں محنت اور کوشش کرتا ہے تو اس کا ہر قول و فعل اس نور میں زیادتی کا سبب بنتا چلا جائے گا اس فعل میں جس قسم اور جس درجے کا اتباعِ سنت ہوگا اسی قسم اور اسی درجے کے نور کا اضافہ ہوگا۔ اور ان نورانی تاروں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اور اگر ترکِ اعمالِ شرعی یا خلافِ سنت اعمال ہوں گے تو اس ایک تار کی نورانیت مدہم ہوتی چلی جائے گی۔

ایک بات یاد رکھیے حضور اکرمؐ کی کوئی سنت معمولی نہیں بلکہ حضور اکرمؐ کی ہر سنت عند اللہ خاص اہمیت رکھتی ہے لہٰذا مسلسل خلافِ سنت سے اس تار کے کٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے جب یہ تار کٹ جاتا ہے تو آدمی آوارہ ہو جاتا ہے اور مذاہبِ باطلہ میں سے کوئی نہ کوئی اسے اُچک لے جاتا ہے۔ لوگ جو حق کو چھوڑ کر باطل کی گود میں جا بیٹھتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ حق کو شعوری طور پر قبول کرنے کے بعد اسے بقائمی ہوش و حواس ترک کرتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ دلما یدخل الایمان فی قلوبکم یعنی وہ قلبی طور پر حق سے ناآشنا اور بے گانہ ہوتے ہیں ورنہ مذہب تبدیل کرنا تو اتنا مشکل کام ہے کہ آپ ایک بت پرست سے بھی اس کے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے پتھر کی پوجا بھی نہیں چھڑا سکتے حالانکہ اس حرکت کا عقل سلیم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک مسلم دینِ فطرت یعنی اسلام کو کسی وجہ سے چھوڑ دے اور اس تبدیلیٔ مذہب اور باطل کو قبول کر لینے کی اصل وجہ اس قلبی تعلق کا تار کا کٹ جانا ہوتا ہے اب وہ کٹے ہوئے پتنگ کی طرح جس جھاڑی سے اُلجھ گیا وہیں کا ہو رہا۔

حضور اکرمؐ کے ساتھ دوسرا تعلق حضورؐ کی صحبت کا ہے۔ یہ وہ تعلق ہے کہ جب اس دنیا میں حضور اکرمؐ حیاتِ دنیوی کے ساتھ موجود تھے تو اس تعلق نے چند انسانوں کو بھی شرفِ صحابیت عطا کر دیا مگر جب حضور اکرمؐ اس دنیا سے پردہ فرما گئے تو جسمانی طور پر حضورؐ کی صحبت کے شرف کے حصول کا امکان

ختم ہو گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کا کوئی فیض منقطع نہیں کیا۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض ایمان کا تعلق منقطع نہیں ہوا تو فیضِ صحبت کا تعلق بھی منقطع نہیں ہوا۔ ہاں اس کی صورت بدل گئی کہ پہلے یہ فیض کا تعلق جسمانی اور روحانی دونوں قسم کا تھا اب صرف روحانی رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فیضِ صحبت کو صحابہؓ، ان سے تابعین ان سے تبع تابعین کے سینوں میں منتقل کیا۔ مگر چونکہ یہ ایک کیفی معاملہ ہے اور کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہنایا نہیں جا سکتا لہٰذا وہ نہ کتابوں میں درج ہو سکتی ہے اور نہ درسیات کے نصاب میں داخل ہو سکتی ہیں۔ جو کیفیت صحبتِ نبویؐ سے قلوبِ صحابہؓ نے اخذ کی وہی کیفیت صحبت صحابہؓ سے قلوبِ تابعین نے اخذ کی اور یہ دونوں فیض نسلاً بعد نسلٍ چلتے آئے۔ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ حضورؐ کے زمانہ میں حضورؐ کے سامنے کتنے لوگ مکہ اور مدینہ میں رہے مگر حضورؐ کے فیض سے محروم رہے۔ آخر کیوں؟ کیا معاذ اللہ حضورؐ کے فیض میں کمی تھی یا حضورؐ نے اس کی تقسیم میں بخل کیا۔ نہیں بلکہ ان محرومانِ ازلی کے قلوب نورِ ایمان سے خالی تھے جو اخذِ فیض کے لئے بنیاد بنتا ہے اس نورِ ایمان کا اصطلاحی نام صحت عقیدہ سمجھ لیجئے لہٰذا اگر عقیدہ صحیح نہیں تو حضور اکرمؐ سے اخذِ فیض ممکن نہیں

صحتِ عقیدہ کے بعد اخذِ فیض کے لئے اہلِ دل کی صحبت ضروری ہے جن کے سینوں میں یہ فیضِ صحبت سینہ بسینہ منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قلبی ربط اور تعلق قائم ہو گا۔ یہ ایک کیفیت کی دولت ہے جس کے سینے میں یہ نور نہ ہو وہ بانٹے گا کیا اور اس کی صحبت سے وہ کیفیات حاصل کیسے ہوں گی۔ یہ کیفیات کوئی خاندانی میراث نہیں کہ باپ کے بعد بیٹے کو منتقل ہو جائے یہ تو مجاہدہ اور ریاضت سے حاصل ہوتی ہے اس لئے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ دولت صرف کسی ایسے خاندانی فرد سے ملے گی جس کے آباؤ اجداد میں کوئی صاحبِ دل گزرا ہو۔ اس لئے جہاں کوئی ایسا شخص مل جائے جس کے پاس یہ کیفیات ہوں۔ یہ تجلیات ہوں یہ رابطہ ہو تو بقول عارف ہونا یہ چاہیئے کہ ؎

چنیں مردے کی یابی خاک او شو
اسیر حلقۂ فتراک او شو

کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان پر اللہ کا سب سے بڑا احسان اور انعام نورِ نبوت اور فیضانِ صحبت نبویؐ ہے اس لئے ایسے لوگوں کی تلاش میں ہی عمر کھپ جائے تو یہ خسارے کا سودا نہیں اور اگر کوئی ایسا اہلِ دل مل جائے اور آدمی محض اپنی غفلت کوتاہ اندیشی یا کسی اور وجہ سے ان کے فیض سے محروم رہ جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی خسارہ بھی نہیں کاروباری مشاغل کا بہانہ بنا لیا۔ یا یہ کہ بیوی بیمار تھی ایسا کوئی بہانہ کل اللہ کے ہاں کام نہیں دے سکے گا۔ اسی امر کا ہی امتحان ہے کہ انسان

کے دل میں اہمیت کس کام کی ہے۔ زیادہ اہمیت والے کام کی خاطر کم اہمیت والے کام کی قربانی دے سکتا ہے یا نہیں۔ قرب الٰہی کے حصول کو ناقابل التفات سمجھ کر دنیوی دھندوں میں کھپا رہنا اور فانی رابطوں کے بندھنوں میں اپنے آپ کو جکڑے رکھنا اور رب العالمین سے ابدی رابطہ قائم کرنے کی فکر پیدا نہ ہونا انسانیت کی توہین ہے۔ فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا جبھی تو کہا گیا ہے کہ طاعتِ الٰہی کے لئے فرشتے کو کوئی قربانی نہیں دینا پڑتی۔ مگر انسان کے لئے تو دنیا میں سینکڑوں پابندیاں ہیں۔ بندھن ہیں۔ لذات کی کشش ہے ان بندھنوں کو توڑ کر قرب الٰہی حاصل کرے گا تو فرشتے سے بہتر کیونکر نہ ہوگا۔ طاعت اور عبادت میں وقعت اور وزن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی بکھیڑوں کو اللہ اکبر کہہ کر قطع کر دیتا ہے۔

دین کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ثانوی حیثیت میں رہنا اپنی توہین سمجھتا ہے یہ محکوم بن کر نہیں رہتا لہٰذا دیندار وہی ہے جو دین کو اپنی رائے کے اوپر مسلط کرے اور اگر اپنی رائے کو دین پر مسلط رکھا تو یہ دینداری کا سوانگ ہے۔ محض ایکٹنگ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں اس سے ایک نکتہ اور سامنے آیا کہ جب تک فکر کی اصلاح نہ ہوگی سوچ کا انداز نہیں بدلے گا ذکر کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور ذکر کی حقیقی برکات حاصل نہیں ہو سکتیں ذکر و فکر یا نور ایمان اور نور فیضان صحبت نبوی جب دونوں مل جائیں تو قربِ الٰہی کے لئے زینہ میسر آگیا آپ دیکھتے نہیں کہ جہاں وجود باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچا وہاں ارواح اور ملائکہ مقربین قدم نہیں رکھ سکتے یعنی حضور اکرمؐ کے وجود باجود میں وہ تجلیات اور وہ فیوضات ہیں جن سے فرشتے بھی آشنا نہیں جب وجود محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی عظمت یہ ہے تو روح محمد رسول اللہؐ کی عظمتوں کا احاطہ بلکہ تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ اس لئے جب روحِ اطہر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سالک کے قلب و روح کا رابطہ قائم ہو جاتا ہے تو روح میں لازماً قوتِ پرواز پیدا ہو جاتی ہے اور سالک کی روح اپنی منزل کا نشان بارگاہِ نبویؐ سے پاتا ہے اس کیفیت کا نام اصطلاح تصوف اور سلوک میں فنا فی الرسول ہے اس مراقبہ کی خاصیت اور کیفیت یہ ہے کہ سالک کا جسم خواہ کہیں ہو اس کی روح آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں میں ہوتی ہے یہیں سے رفتہ رفتہ دوام حضور نبوی کی دولت حاصل ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی معلوم کر لینی چاہیئے کہ مراقبہ فنا فی الرسول جب تک حاصل نہ ہو تصوف سلوک میں کوئی مقام حاصل ہونا ممکن نہیں۔

مراقبہ فنا فی الرسول راسخ ہونے کا انسان کی عملی زندگی پر یہ اثر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی پسند حضور اکرمؐ کی پسند کے تحت ہو جاتی ہے سنت کی خلاف ورزی

سے اس کی روح کانپ اٹھتی ہے اگر عملی زندگی ایسی نہیں تو اسے مراقبہ فنا فی الرسول نصیب نہیں کیونکہ اگر روح بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو تو حضورؐ کے سامنے بیٹھ کر بھلا کوئی حضورؐ کی اداؤں کے خلاف کر سکتا ہے۔ جب روح میں یہ کیفیت موجود نہیں تو وجود اتباعِ سنت کیا خاک کریگا ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام سالکین اپنے اندر اس کیفیت کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اپنی عملی زندگی میں قدم قدم پہ جائزہ لیتے رہیں کہ روح نے جسم پہ کوئی اثر مرتب کیا ہے یا نہیں۔ ملت کا المیہ یہ ہے کہ لوگ بڑی بے باکی سے سنتِ نبوی کو ٹھکراتے ہیں بلکہ عمداً سنت کے خلاف کام کرتے ہیں۔ اور امت کی کشتی کے کھویا اور مسلمانوں کے روحانی رہنما اور مرشد کامل بھی بنے ہوئے ہیں اور جبہ قبہ سے دکان بھی سجا رکھی ہے یہ حرکت ابلہ فریبی تو بلا شبہ اعلیٰ درجے کی ہے مگر خود فریبی میں بھی شبہ نہیں۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جسے فنا فی الرسول کا مراقبہ حاصل ہو جائے۔ اس سے کوئی غلطی لغزش یا گناہ ہوتا ہی نہیں۔ ہاں اس کا اثر یہ ضرور ہوتا ہے کہ خلافِ سنت فعل سرزد ہو جائے تو روح کی گہرائیوں میں اس کی تلخی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر اس احساس کے ساتھ ندامت ہوتی ہے پھر توبہ کی تحریک ہوتی ہے۔ یہی احساس تعلق کی دلیل ہے۔

اگر روح کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق ہی نہ ہو تو خلافِ سنت فعل پہ لذت محسوس ہونے لگتی ہے اور اپنی اس بدتمیزی پہ اترانے لگتا ہے۔ ایسا شخص یقیناً کوچہ نبوی سے ناآشنا ہے۔ اس کا کہیں اس گلی میں گذر ہی نہیں ہوا۔ روحانی پیشوا یا ہادی رہنما کے جانچنے کا یہ ایک حتمی معیار ہے۔

خلاصہ یہ کہ

اگر اخذِ فیض کی خواہش ہے تو پہلے اپنی سوچ کا رُخ درست کرو۔ پھر اپنے اندر ایثار کا جذبہ پیدا کرو۔

ایثار کس کا؟ خواہش نفس کا — اپنی رائے کو دین پر مقدم سمجھنے کا، اور یہ چیزیں حاصل ہوں گی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہ کامل اعتماد، قلبی محبت، اور اتباعِ سنت کی انتہائی کوشش کے ساتھ کسی اہلِ دل کی صحبت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کا سلیقہ سیکھے اور اس پر ہمیشہ کے لئے ڈٹ جانے سے۔

اللّٰھم نوّر قلوبنا بنور المعرفتہ والایمان
بحرمۃ نبی آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم

٭

● — ظاہری جسم کے (خلافِ شریعت) مقتضیات پر عمل مت کر۔ اس کو ترک کرو
تب تم کو عروج روحانی
حاصل ہوگا۔ (ا - ع - ت)

پروفیسر حافظ عبدالرزاق صاحب
ایم۔اے

چراغ مصطفویؐ

عن سھل بن سعد قال جاء رجل فقال یارسول اللہ دلنی علی عمل اذا انا عملتہ احبنی اللہ واحبنی الناس قال ازھد فی الدنیا یحبک اللہ وازھد فیما عند الناس یحبک الناس ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ:۔ "حضرت سہل فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور کہا یا رسول اللہ آپ مجھے کسی ایسے کام کی نشان دہی فرمائیں کہ جب میں وہ کام کروں تو اللہ تعالےٰ بھی مجھے پسند کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کی محبت سے اپنے دل کو بچائے رکھو، اللہ تعالےٰ تجھے پسند کرے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس کی حرص اور لالچ کو دل میں نہ آنے دو لوگ تجھے پسند کریں گے۔"

تشریح:۔ اس حدیث میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سائل کے سوال میں حضور اکرمؐ کی تربیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ کہ حضورؐ کس جامعیت سے اپنے صحابہؓ کی ہمہ پہلو تربیت فرماتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ صحابہ کو کتاب اللہ کی تعلیمات سے کتنا شغف تھا۔ قرآن کریم میں ایک دعا سکھائی گئی ہے "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ"۔ اس سائل کا سوال بھی اتنا جامع ہے کہ اس میں یہ دونوں پہلو ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ مگر ان کی ترتیب میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ صحابہ کرامؓ ہمیشہ اللہ تعالےٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کو مقصود سمجھتے تھے۔ مگر جس معاشرے میں زندگی بسر کرتے تھے اس میں اپنی شخصیت اور اپنا کردار اس قسم کا پیش کرنا چاہتے تھے کہ لوگوں کو ان سے اُنس و محبت ہو ان کی سیرت ایسی نہ ہو کہ لوگ ان سے نفرت کریں۔

تیسری بات: سائل کے قول "علی عمل" سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا پختہ یقین تھا کہ حضور اکرمؐ

کی تعلیمات میں ایسی جامعیت پائی جاتی ہے کہ کوئی ایک ہی عمل ایسا بتائیں گے کہ اس سے یہ تمام مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں سب سے پہلے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ جوامع الکلم کی تفسیر ہے دوسری بات ہے کہ حضور اکرمؐ نے سائل کو اعمال کی کوئی لمبی فہرست نہیں دی۔ بلکہ صرف ایک عمل کی نشان دہی فرمائی اور وہ ہے "زہد" زہد کی حقیقت تلذذات، زوائد اور لایعنی سے بے رغبتی ہے بے رغبتی کا مطلب ترک شے نہیں بلکہ بے رغبتی سے مراد وہ کیفیت ہے کہ اگر وہ شے میسر نہیں تو اس کے لئے کڑھتا نہ رہے اور اس کے حصول کے لئے سب کچھ بھلا نہ دے اور اگر وہ شے میسر ہے تو اس پر اتنا فریفتہ نہ ہو کہ اسی میں محو ہو جائے صرف اسے بچانے کی خاطر دنیا کی ہر چیز کی قربانی کے لئے تیار ہو جائے یہ عجیب المیہ ہے کہ زہد کے بارے میں بھی لوگوں نے وہ ٹھوکر کھائی کہ تریاق کو زہر بنا کر رکھ دیا۔ حالانکہ زہد کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ چیز کام چلانے کے لئے ہے دل لگانے کے لئے نہیں۔ رغبت اور بے رغبتی یا استفادہ اور محویت کا فرق مولانا رومؒ نے ایک شعر میں بتا دیا ؎

آب زیر کشتی او پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

یعنی پانی کشتی کے نیچے ہو اور کشتی اس کی سطح پر ہو تو اسے تیرا کر کہیں سے کہیں لے جایا جاتا ہے مگر وہی پانی اگر کشتی کے اندر بھر جائے تو کشتی کو ڈبو کے رکھ دے گا اور اہل کشتی تباہ ہو جائیں گے۔ بس اصل زہد یہی ہے۔ یعنی اس دارالاسباب میں شریعت کی ہدایات کے مطابق اسباب سے ضرور کام لو۔ یہ ہے آب زیر کشتی مگر اسباب کی محبت اگر تمہارے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہو گئی تو یہ کیفیت "آب در کشتی" کی ہے۔ یہ اس لئے تباہی کا موجب ہے کہ اس سے تعلق مع اللہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور مومن کا اصل سرمایہ ہی محبت الٰہی ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضورؐ نے "زہد" کی نشاندہی فرما کر اس حقیقت کی وضاحت فرما دی کہ حقیقی مطلوب باطن کی اور قلب کی اصلاح ہے جیسا کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ "جسم انسانی میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ سنور گیا تو سارا نظام سنور گیا اور اگر وہ بگڑ گیا تو سارا نظام بگڑ گیا۔ کان کھول کر سن لو وہ ٹکڑا قلب ہے"۔

زہد کا محل قلب ہے۔ بے رغبتی اور رغبت کے سوتے قلب سے پھوٹتے ہیں اس لئے زہد کا وصف پیدا کرنے کے لئے دل کی دنیا کا جائزہ لینا پڑے گا۔ گویا حضور اکرمؐ نے تعلیم دی کہ اعمال کے رد و قبول کا دارومدار قلب کی حالت پر ہے۔ اعضا و جوارح تو قلب کے جذبات کے اظہار کا آلہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے اندر جھانکتے رہو۔

چوتھی بات یہ ہے کہ حضور اکرمؐ نے زہد کے لئے دو رُخ متعین فرمائے۔ ان میں سے ہر ایک کی خصوصیت جُدا ہے۔

زہد کے لئے پہلا میدان "دنیا" ہے۔ دنیا کیا ہے؟ حُبُّ الشہوات تو زہد فی الدنیا یہ ہوا کہ شہوات سے بے رغبتی ہو۔ رغبت اور بے رغبتی کا محل قلب ہے قلب دنیا کی رغبت سے خالی ہو گیا تو کیا وہ خالی ہی رہے گا۔ قانونِ قدرت یہ ہے کہ فطرت کہیں خلا نہیں رہنے دیتی لہذا قلب بھی خالی نہیں رہ سکے گا۔ قلب ہو اور محبت سے خالی ہو یہ ممکن نہیں جب ماسوا کی محبت سے خالی ہو گیا تو لازماً اس میں اللہ ہی کی محبت ہو گی گویا زہد فی الدنیا کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ اس قلب کو پسند کرے گا جس میں اس کی محبت ہو گی۔ سائل کا ایک مقصد حاصل ہو گیا۔

رہی دوسری بات تو اس کے لئے حضور اکرم ؐ نے "ازھد فیما عند الناس" فرمایا۔ پہلے "فیما" عند الناس کا علم ہو تو زہد کی طرف قدم بڑھائے۔ لوگوں کے پاس وہ کونسا سرمایہ ہے جس کے لئے کسی دل میں طمع یا لالچ پیدا ہو سکتا ہے؟ دو چیزیں سامنے کی ہیں مال اور جاہ۔

انسان کی ساری دوڑ دھوپ ان دو چیزوں کے لئے ہے۔ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ سب سے زیادہ مال میرے پاس ہو اور سب سے بڑھ کر عزت و اقتدار مجھے حاصل ہو۔ جب تمام انسانوں کا مطمح نظر یہی اور ساری دوڑ اسی کے لئے ہے تو لازماً مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گا ہر شخص دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا یا دوسرے کو پیچھے دھکیلنے میں کوشاں ہو گا۔ لازمی باہمی نفرت پیدا ہو گی اور جو امور باعثِ نفرت ہوں ان کے ذریعے یا ان کے ہوتے ہوئے محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔

اور معاشرے میں باہمی محبت مطلوب ہے ورنہ امن قائم نہیں رہ سکتا۔ لہذا اس کا نسخہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے رغبتی پیدا کر لو۔ نتیجہ کیا ہو گا؟ یہی کہ انہیں یہ دھڑکا نہیں لگا رہے گا کہ اس کی ہمارے مال و جاہ پر نظر ہے اس سے ہمیں خطرہ ہے جب یہ کیفیت ہو گی تو نفرت کے جذبات اُبھرنے کا موقع ہی نہ رہے گا۔

نتیجہ یہ ہو گا

کہ لوگوں کے دلوں میں ایسے شخص کے متعلق نہ صرف یہ کہ کوئی کھٹکا نہ ہو گا بلکہ وہ اسے پسند کریں گے اس سے محبت کریں گے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو صرف "احبنی اللہ" کا نسخہ نہیں بتایا جس سے ظاہر ہے کہ "احبنی الناس" بھی کسی درجے میں مطلوب ہے۔ یعنی اسلام دین فطرت ہے۔ اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات یقیناً وہی ہیں

جو

انسانی فطرت کی ضرورت ہیں۔

اور

انسانیت کی بقا اور فروغ کے لئے مطلوب ہیں۔

ایک خط

حضرت العلام مولانا اللہ یار صاحب مدظلہ، کے نام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ کے نام نامی سے واقفیت تو تھی ایک دو رسالے بھی نظر سے گزرے تھے جن میں آپ کے سلسلہ تصوف کی طرف لوگوں کو صلائے عام اور ترغیب تھی لیکن دلائل السلوک نہیں دیکھی تھی۔ اب اس کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ جس نے بہت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ واقعی ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے جس سے آپ کے تبحر علمی، قوت استدلال۔ شریعت و طریقت پر عبور و عمل کا پتہ چلتا ہے۔ تصوف کو جزو دین ثابت کرنے میں تو آپ نے قاطع برہان اور دلائل بہم پہنچائے ہیں۔ حدیث احسان اور دیگر احادیث و نصوص کو وہ معانی پہنائے کہ اب معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ان کے یہی معانی تھے۔ مگر ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ خداوند کریم آپ کو جزائے خیر دے۔ انشاء اللہ کبھی حاضر خدمت بھی ہو جاؤں گا۔ فی الحال چند سوالات استفادۃً پیش خدمت کر رہا ہوں اُمید ہے جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

۱۔ میں عملاً تو صفر ہوں۔ مگر کتب ہائے تصوف متعلقہ سلاسل متفرقہ بشمول یوگ، رہبانیت وعلوم باطنی یہود و نصاریٰ وغیرہ کا مطالعہ شدت سے کرتا رہتا ہوں۔ ہر ایک کا کشف و مشاہدہ دوسرے دوسرے سے مختلف ہی ہے۔ وجودیہ و شہودیہ حضرات کے مباحث کو تو چھوڑیئے وہ تو فلسفہ میں بھی موجود ہیں۔ سلسلوں میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ آپ نقشبندی حضرات لطائف پر زور دیتے ہیں۔ باقی سلاسل والے کہتے ہیں کہ لطائف کے بجائے لطیف کی طلب و تلاش کریں۔ اس طرح ہم قارئین کے ذہنوں میں سوائے اُلجھن کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ میرے یہ سوالات آپ کی کتاب کی چند عبارات کے متعلق ہیں صرف وضاحت ہو جائے تو مہربانی ہوگی۔ جس طرح آپ نے افغانستان والے عالم کے سوالوں کے سلسلے میں فرمائی۔

۱۔ آپ نے ایک صاحب مزار کے متعلق لکھا ہے کہ لوگ تو مزار پر چادریں چڑھاتے ہیں اور وہ بشکل سگ گرفتار عذاب ہے۔ اگر آپ نشان دہی فرما دیں تو ہمارے لئے مفید ہوگا۔ ایسے عذاب قبر بعض اور حضرات نے بھی لکھے ہیں۔ لیکن مجھے تردد اس بات میں ہے کہ اس قسم کا عذاب قبر خلاف فطرت اور خلاف تحقیق ہے قبریں نئی اور پرانی کئی دیکھی گئی ہیں۔ وہاں تو کافر و مسلمان کے لئے ایک ہی قانون فطرت نظر آتا ہے گلی سڑی لاشیں یا استخوان خستہ و شکستہ قبریں تو کوئی کتا، بلا نہیں بنتا۔ قبر سے مراد عالم برزخ ہو تو برزخ میں یہ معاملہ نہیں دیکھا جاتا۔

(۲) قرآن پاک میں بعض آیات کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ اخروی جنت اور دوزخ کے علاوہ برزخی جنت اور دوزخ ثابت ہے۔ بہر حال اگر یہ مانا جائے کہ کافر و گناہگار لوگ برزخی دوزخ میں ہوں گے تو دوزخ کے عذاب کے سلسلہ میں تو آگ کا عذاب ہے۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ آگ میں ہوں اور عذاب کی وہ شکل ہو جو آپ نے تحریر فرمائی ہے۔

(۳) آج کل تمام یورپ میں روحوں کو بلا کر ان سے باتیں کی جاتی ہیں بلکہ آج کل تو یہاں تک ہو گیا ہے کہ مقتول کی روح کو بلا کر قاتل کا سراغ لیا جاتا ہے۔ روح سے ملاقات کرائی جاتی ہے۔ ان کے فوٹو لئے جاتے ہیں۔ یہ ارواح گو مشرکین کے ہیں۔ مگر وہ کسی قسم کے عذاب میں نہیں بلکہ روحانی یا برزخی دنیا میں زندگی گذار رہے ہیں جس طرح اس دنیا میں تھے تاہم یہ درست ہے کہ وہاں ان کے مراتب میں فرق ہے۔ ان مشاہدات سائنسی سے انکار کرنا ایسے ہی ہے جیسے آدمی کے چاند پر جانے سے انکار کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ نور محمد کلرچوئی صاحب "عرفان" نے اس مسئلہ پر یہ تحقیق پیش کی ہے کہ وہ ارواح نہیں ہوتیں بلکہ ہمزاد شیاطین ہوتی ہیں۔ یہ نظریہ کوئی ٹھوس نہیں ہے۔ حالانکہ مصنف نے اپنے بڑے بڑے کشف تحریر فرمائے ہیں۔ غالباً آپ ان کو جانتے ہوں گے۔ ایک بڑے طبقے کے پیر ہیں۔ اور آپ ہی کی طرح ادیسی ہیں۔ 'عرفان' ان کی مشہور کتاب ہے۔

(۴) عالم خواب میں انسان عالم برزخ تک پہنچ جاتا ہے مگر وہاں نیکوکار اور گنہگار ملتے ہیں وہ کسی عذاب ہی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بعض آدمی بیداری میں عالم برزخ میں گھومتے ہیں انسانوں اور فرشتوں سے ملتے ہیں۔ اس مشق کو (PROJECTION INTHE AUSTRAL WORLD) کہتے ہیں اس مشق پر کئی سلسلے غیر مسلموں کے اور مسلموں کے بھی مبنی ہیں۔ انسان کے اندر جو (AUSPRAL BODY) یا نسمہ ہوتا ہے وہ انسان کے جسم سے نکل جاتا ہے اور مشاہدات کرتا ہے۔ حضرت ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب "الطاف القدس" میں نسمہ اور نفس ناطقہ اور روح علوی وغیرہ کا ذکر کیا ہے

یہ تحقیق غیر مسلموں کی تحقیق کے مطابق ہے۔

سوال نمبر۲:۔ آپ نے چند اغوات کا ذکر فرمایا ہے۔ ماسوائے حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ کے باقی سب غیر معروف ہیں۔ حضرت احمد علیؒ لاہوری نے تحریر میں لکھدیا ہے کہ اصلی علی ہجویری قلعہ کے اندر ہیں۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ غیر معروف حضرات تو غوث ہوں اور عظیم اولیا حضرت مخدوم علی ہجویریؒ۔ حضرت فرید الدین مسعودؒ گنج شکر۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ اجمیری تو محض قطب کے درجہ تک ہیں۔ مگر یہ غیر معروف حضرات اغوات ہیں۔ اگر اصلی علی ہجویریؒ قلعہ کے اندر ہیں تو خواجہ اجمیرؒ سے لے کر اب تک لاکھوں اولیاء اللہ نے داتا گنج بخش کے مزار پر کیوں چلہ کشی کی کیا ان پر یہ راز نہیں کھلا کہ قلعہ کے اندر ہیں اس میں آپ اور حضرت لاہوریؒ منفرد (۱۷۴۷) کے حامل ہیں۔

سوال نمبر۳۔ اگرچہ آپ نے درست طور پر صاحب جواہر القرآن مولانا غلام اللہ خان مرحوم پر تنقید کی ہے مگر مولوی حسین علی صاحب ان کے استاد کے آپ بھی قائل ہیں۔ ملتان کی تحصیل شجاع آباد موضع بہل میں ایک بزرگ دیوبندی تھا۔ غالباً عبداللہ نام تھا اب فوت ہوچکے ہیں ان کے علم اور عمل کے بہت سے لوگ قائل تھے۔ وہ بھی مولوی حسین علی صاحب کے قائل تھے۔ مگر ایک بزرگ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب جو کہ عرب و عجم میں مشہور ہوئے ہیں دیوبندی، بریلوی تعصب سے بالاتر تھے۔ کیونکہ حضرت امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی سے خلافت یافتہ بھی تھے۔ ان کا مناظرہ مولوی حسین علی صاحب سے ہوا اور انہوں نے ان کو مردود قرار دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آپ لوگوں کے کشوف میں اتنا تضاد کیوں ہوتا ہے۔

یہ تمام سوالات استفادۃً لکھے گئے ہیں امید ہے کہ آپ کچھ روشنی ڈالیں گے۔ تاکہ میری اپنی تحقیق بھی اس سلسلہ میں کچھ آگے بڑھ سکے۔

نیاز مند

جوابِ خط

از مولانا - اللہ یار خان صاحب مدظلہ

عزیزم ! عاقبت بخیر باد !

السلام علیکم ورحمتہ وبرکاتہ

آپ کا طویل اور فکر انگیز مکتوب ملا - آپ نے اس کی ابتدا میں میری کتاب دلائل السلوک اور میری ذات کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا - وہ بس آپ کے تاثرات ہیں - الحمد للہ آپ نے حقائق کو بھانپ بھی لیا اور اس کا اعتراف بھی فرمایا - پہلے پیراگراف کے بعد آپ نے جو روش اختیار فرمائی اور ان مذکورہ تاثرات سے بالکل مختلف ہے ان دونوں اجزاء کو ملانے سے نقشہ کچھ یوں بنتا ہے جیسے کوئی ماہر نقاش اپنی فنی مہارت کا اظہار کرتے ہوئے طرح طرح کے نقش و نگار بنائے مگر جب مکمل کر چکے اور ایک بڑا سا برش لے کر تمام بیل بوٹوں پر سیاہی پھیر دے - مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ انسان کی کیفیات بدلتی رہتی ہیں اور اتفاق سے اگر مزاج شاعرانہ ہو تو بات وہ بن جاتی ہے کہ "چھان کا پوت پل میں ولی پل میں بھوت" -

آپ نے دوسرے حصے کی ابتدا ان الفاظ سے کی کہ "چند سوالات استفادۃً پیش کر رہا ہوں" جذبہ نیک ہے موقف طالبعلمانہ ہی اچھا ہوتا ہے گو آگے جا کر آپ کا انداز کہیں مجتہدانہ ہے کہیں مفتیانہ ہے - یہ صورت بھی اسی انسانی نفسیات کے کمزور پہلو ہیں آپ کے سوالات کے جواب حاضر ہیں -

۱- آپ نے فرمایا سلسلوں میں بڑا اختلاف ہے ؟

الجواب : آپ جیسے محقق اور کثیر المطالعہ شخص کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہونا اور آپ کے قلم سے یہ اشتباہ زیب قرطاس بننا بہت بڑا المیہ ہے -

• آپ یہ فرمائیں کہ کیا مختلف سلسلوں کے ہاں مقصود مختلف ہیں - منزل جدا ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا مقصود تک پہنچنے کے لیے ذرائع سفر کا اختلاف کیا بڑا اختلاف چھوڑ اختلاف بھی کہلا سکتا ہے ؟ چند آدمیوں کو راولپنڈی سے کراچی جانا ہے کوئی ریل سے جاتا ہے کوئی کار سے کوئی ہوائی جہاز سے تو آپ کیا پریشان ہو جائیں گے کہ ان لوگوں میں بڑا اختلاف ہے ؟ -

۲- آپ نے فرمایا - آپ نقشبندی حضرات لطائف پر زور دیتے ہیں باقی سلاسل والے کہتے ہیں لطائف

کی بجائے لطیف کی طلب و تلاش کریں۔"

الجواب: اس قول میں دو دعوے ہیں اور دونوں بلا دلیل کسی سلسلہ والے مجتہد فی التصوف بزرگ یا کسی عظیم شخصیت کا قول پیش کیجئے کہ لطائف کی جگہ لطیف کی تلاش کرو۔ یہ بات کہیں نہیں ملے گی۔ یہ کہنا اس صورت میں ممکن تھا جب ایک مقصود لطائف ہوتا دوسرے کا لطیف مگر جب مقصود سب کا لطیف ہی ہے اور ذریعہ سب کا لطائف ہی ہے تو کوئی صحیح الدماغ آدمی یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی نے لطائف میں تفصیل کی راہ اختیار کی کسی نے اجمالی بیان پر اکتفا کیا۔ سب کو طلب لطیف کی ہے ذریعہ سب کا لطائف ہی ہیں اور لطائف کے بغیر سلوک کا حصول محال ہے۔

آپ نے اس مکتوب میں حضرت شاہ ولی اللہ رح کی الطاف القدس کا حوالہ دیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وہی کتاب پڑھائی جائے۔

(ا) شاہ صاحبؒ نے اس کتاب کی وجہ تالیف بیان فرمائی ہے۔

" ایں ورقے چند است معروف بالطاف القدس فی معرفۃ لطائف للنفس و بیان حقیقت قلب عقل، نفس، روح، سر، خفی، اخفی، حجر بحت، دانا، و طریق تہذیب ہر یکے ازانہا " (ص ۲)

اب آپ سوچیں کہ اگر یہ لطائف غیر اللہ ہی ہیں تو شاہ صاحبؒ جیسے محقق شخص نے ایک مستقل کتاب کیوں تصنیف کر ڈالی؟ جس کا مقصد ہی لطائف کی حقیقت بیان کرنا اور ان کی تہذیب کے طریقے سکھانا ہے۔

(ب) پھر لطائف کی اہمیت بیان فرماتے ہیں۔

"علم لطائف ایسی عظیم میزان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متاخرین صوفیہ کو عطا فرمائی ہے۔ جو لطائف کو جس قدر زیادہ جانتا ہے اسی قدر تہذیب نفس اسے آتی ہے اور جس قدر لطائف کے احکام کی قدرت زیادہ رکھتا ہے اسی قدر زیادہ ارشاد کی قدرت ہے۔" (ص ۳)

کیا متاخرین صوفیہ سے مراد صرف نقشبندی حضرات ہیں اگر نہیں اور واقعی نہیں بلکہ تمام سلسلوں والے صوفیہ ہی مراد ہیں تو شاہ صاحب کا موقف یہ ہے کہ ارشاد و تربیت کی قدرت کا انحصار لطائف کی تہذیب اور ان کے احکام کی قدرت پر ہے تو کیا نقشبندیہ کے بغیر دوسرے سلسلوں والوں کو ارشاد و تربیت کی ضرورت نہیں۔

(ج) پھر فرماتے ہیں اگر علم لطائف نہ جانے تو اس کو کئی ضرر پہنچتے ہیں" پھر تفصیل سے چار ضرر بیان فرمائے ہیں (ص ۵)

(د) پھر فرماتے ہیں: فصل پنجم تہذیب میں پانچ لطیفوں کے بموجب روش سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ اور اسے طریقت و معرفت کہتے ہیں" (ص ۳۸)

کیا حضرت جنید بغدادیؒ کا تعلق صرف نقشبندیہ سے ہے اور کیا طریقت و معرفت صرف نقشبندیہ ہی کو

درکار ہے؟ اور جنید لطائف کی تہذیب کا نام ہی طریقت و معرفت ہے تو یہ "لطیف" سے غیر کیوں ہیں۔

(س) پھر فرماتے ہیں: "الحاصل حضرت جنید سید الطائفہ قدس سرہٗ کے سلوک کی بنا پانچ لطیفوں کی تہذیب پر ہے۔"

"سید الطائفہ حضرت جنید قدس سرہٗ اول وہ شخص ہیں کہ تعمق سے نکل کر راہ متوسط اختیار کی اور ہر ریاضت کو اس کی جا مقرر کیا۔ صوفیوں میں سے جو حضرت جنید کے بعد پیدا ہوا وہ اس کی راہ پر چلا ہے اور حضرت جنید کا احسان اس کی گردن پر ہے وہ جانے یا نہ جانے" (صفحہ)

غالباً اب تو یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ سب سلسلوں کے ہاں تہذیب لطائف کا نام ہی طریقت و معرفت ہے اور "لطیف" تک پہنچنے کا راستہ یہی ہے۔

فرق اگر ہے تو طرق میں یعنی کوئی ذکر نفی اثبات کرتا ہے، کوئی ذکر اسم ذات کرتا ہے کوئی ابتداء میں جہر پھر خفی کوئی اوّل آخر خفی کوئی حبس نفس سے کوئی خیال اور تصور سے لہٰذا یہ طرق میں رنگا رنگی مقصود میں خلاف ہرگز نہیں۔

۳۔ ایک صاحب مزار کے متعلق آپ کا ارشاد کہ

(ا) اس کی نشان دہی فرمائیں

(ب) عذاب قبر خلاف فطرت اور خلاف تحقیق ہے،

(ج) مسلمانوں اور کفار کی بوسیدہ قبریں دیکھی ہیں قبر میں کوئی کتا بلا نہیں بنتا۔

(د) برزخ میں یہ معاملہ نہیں دیکھا جاتا۔

الجواب (ا) اگر مزار کی نشاندہی کر دی جائے تو آپ کو کیا فائدہ ہو گا؟ آپ فائدے کی نشاندہی کر دیں تو قبر کی نشان دہی بھی کر دی جائے گی۔

(ب) خلاف فطرت ہونے کی دلیل کیا ہے؟ تحقیق کس کی معتبر اور حرف آخر ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ عذاب قبر کے متعلق خلاف فطرت ہونے کا دعویٰ کرنا ہی خلاف فطرت ہے کیونکہ فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ جزا از جنس اعمال ہو۔

رہا خلاف تحقیق ہونے کا سوال تو مسلمان علمائے ربانی اور صوفیہ کرام جو اس فن کے ماہر ہوئے ہیں ان کی تحقیق اگر اس کے خلاف ہے تو نشاندہی فرمائیں کفار کی تحقیق اور اس عالم کے متعلق جو حواس کی زد سے باہر ہے تحقیق نہیں جعل سازی ہے اور اسے تحقیق وہی سمجھے جس کے جسم کی بالائی منزل ویران ہو چکی ہو

(ج) قبروں میں کتا بلا دیکھنا تو دور کی بات ہے آپ تو زندہ جسموں میں بھی کتا بلا نہیں دیکھ سکتے مگر آپ کے نہ دیکھ سکنے سے حقائق نہیں بدل جاتے آپ نے سنا ہو گا اگر نہیں تو کسی طبیب سے پوچھ لیں کہ اگر کسی شخص کو دیوانہ کتا کاٹ جائے تو اس کے جسم کے اندر چھوٹے چھوٹے کتے کے پلے بننے لگتے ہیں حتیٰ کہ وہ کتے کی آواز نکالنے لگتا ہے۔ ایلوپیتھی میں اس کا کوئی علاج نہیں مگر طب یونانی میں اس کا علاج ہے کہ دوا دے کر الٹی کراتے ہیں اور پلے الٹی میں باہر نکل آتے ہیں۔

مریض لفضلہ درست ہو جاتا ہے ابھی کل ہی کی بات ہے ایک ڈاکٹر کو میں نے وہ نسخہ بتایا ہے غرض یہ کہ اس جسم کے اندر کتنے بن رہے ہوتے ہیں مگر آپ کو نظر تو نہیں آتے۔ اسی طرح ڈاکٹر کہتے ہیں پانی کے ایک قطرے میں کروڑوں جراثیم ہوتے ہیں۔ مگر آپ کو نظر تو نہیں آتے مگر آپ انکار نہیں کرتے کیونکہ ڈاکٹروں پر اعتماد ہے تو معلوم ہوا کہ بات دلیل یا عدم دلیل کی نہیں بلکہ بات اعتماد اور عدم اعتماد کی ہے۔ کفار کی بات پر اعتماد ہے اس لئے ان کی ہر الٹی سیدھی بات مان لینا ہی روشن ضمیری ہے اور اللہ و رسول پر اعتماد نہیں اس لئے ان کی بات ماننے میں تردد ہوتا ہے سچ کہا کسی نے ؎

جی نہ چاہے تو نبوت کا بھی ارشاد غلط
من کو بھا جائے تو بھانڈوں کی خرافات بجا

ایک آدمی کے جسم کے اندر کہیں کینسر ہے بظاہر وہ ہٹا کٹا نظر آتا ہے آپ کہیں گے سب غلط ہیں تو کینسر نظر نہیں آتا مگر اس سے پوچھئے اس پر کیا بیت رہی ہے جو درد دکھ کرب اسے لاحق ہے وہی جانتا ہے آپ کو تو نظر نہیں آتا۔ لہذا آپ انکار کردیں تو معذور جب اس گوشت پوست کی دنیا میں یہ حالت ہے کہ

؎ یہ دنیا رنج و راحت کا غلط انداز کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گزرتی ہے

تو عالم برزخ کے متعلق ایسے بے سروپا فتوے دینا کہاں کی عقلمندی ہے عالم برزخ میں قبروں میں بوسیدہ ہڈیوں کو بھی عذاب تو ہو رہا ہوتا ہے مگر اس عذاب کو دیکھنے کے لئے خورد بین درکار ہے اس کے بغیر وہ نظر نہیں آتا۔ اگر پھر بھی تردد ہو تو ننگی آنکھ سے پانی کے قطرے میں جراثیم دیکھ کر تردد رفع کر لیجئے

(د) برزخ میں یہ معاملہ نہیں دیکھا جاتا۔

برزخ کہاں ہے؟ آپ کہاں ہیں؟ آپ کے اور برزخ کے درمیان آمدورفت اور دیکھنے اور دکھانے کے وسائل آپ کے پاس کیا ہیں؟

جب آپ عالم آب و گل میں ہیں اور برزخ کے محل وقوع کا آپ کو علم تک نہیں تو "نہیں دیکھا جاتا" کیا مطلب ہوا؟ اگر کوئی دانشور کہے کہ اس بھلے چنگے آدمی کے پھیپھڑے میں کوئی کیوپٹی نہیں دیکھی جاتی اس پانی کے قطرے میں جراثیم نہیں دیکھے جاتے اس لحیم شحیم آدمی کے پتے میں کینسر نہیں دیکھا جاتا تو اس کا کیا جواب ہوگا؟ یہی نا! کہ دیکھنے والے آلات حاصل کرکے کلی یا فن سے دیکھنے کا سلیقہ سیکھو اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ماہرین فن پر اعتماد کرنا ہی سیکھ لیا جائے

یہاں ایک اصولی بات سمجھنے کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ موت کے بعد انسان دنیا میں ہوتا ہے یا برزخ میں؟

جواب ظاہر ہے کہ برزخ میں ہوتا ہے۔

پھر سوال ہوتا ہے کہ کیا عالم برزخ نہیں نظر آتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نظر نہیں آتا نتیجہ ظاہر ہے کہ جب وہ عالم نظر نہیں آتا تو اس کے احکام کیونکر نظر آئیں۔

(ج) آپ فرماتے ہیں بالفرض عذاب برزخ مان بھی لیا جائے تو عذاب آگ کا ہوگا یہ مفروضہ تو بجا مگر کیا آپ نے آگ کا عذاب کہیں دیکھا ہے؟ اگر نہیں تو اس

وثوق سے یہ کیونکر فرما دیا کہ عذاب آگ کا ہوگا۔ بات بالفرض کی نہیں بلکہ اس حقیقت کی ہے کہ اگر قرآن وحدیث کو مان لیا ہے تو عذاب برزخ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ایمانیات میں مفروضوں کا دخل نہیں ہوتا۔ عالم برزخ خود لطیف، اس کے باسی لطیف، اس کا عذاب لطیف اس کا انعام لطیف اس کے احکام لطیف اور لطیف چیزیں مادی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتیں۔ بلکہ اس مادی دنیا کی لطیف اشیاء بھی مادی آنکھوں سے نظر نہیں آتیں مثلاً اگر کوئی زہریلا جانور کسی کو ڈس لے یا کاٹ لے تو اس کا زہر جسم میں سرایت کرتا نظر نہیں آتا درد نظر نہیں آتا تو کیا اس نظر نہ آنے کی وجہ سے ان حقائق کا انکار کر دیا جائے پھر لطیف دنیا کی لطیف اشیاء کا ان مادی آنکھوں سے نظر نہ آنا انکار کا سبب کیسے بن گیا۔

قرآن کریم سے کم از کم یہ تین مقامات کھول کر غور سے مطالعہ کیجئے اور ان کی روشنی میں اپنا عقیدہ درست کیجئے ورنہ برزخ اور آخرت میں اہل یورپ کام نہیں آسکیں گے۔

۱۔ سورۂ انعام آیت نمبر ۹۳

۲۔ سورۂ محمد آیات نمبر ۲۷، ۲۸

۳۔ سورۂ السجدہ آیات نمبر ۲۰-۲۱

ان آیات سے واضح ہو جائے گا کہ عذاب قبر یا برزخ قبض روح کے وقت سے شروع ہو جاتا ہے اس لئے اپنی آنکھوں پر یا اہل یورپ پر اعتماد کرنے کی جگہ اللہ کی بات پر اعتماد کرنا موزوں بھی ہے اور مفید بھی۔

انتباہ! عذاب قبر ضروریات دین سے ہے سترسے زائد احادیث متواترہ سے ثابت ہے اس کا انکار اسلام سے خارج کرنے کے لئے کافی ہے۔

۴۔ آپ فرماتے ہیں:۔

(ا) روحوں کو بلایا جاتا ہے۔

(ب) ان کے فوٹو لئے جاتے ہیں۔

(ج) گو وہ مشرک ہیں مگر کسی قسم کے عذاب میں نہیں ہیں۔

(د) وہاں ان کے مراتب میں فرق ہے

(س) سائنسی مشاہدات کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔

الجواب: (ا) اگر آپ نے قرآن کریم پڑھا ہے تو یہ آیت قرآنیہ آپ کے مطالعہ سے گزری ہوگی۔

النار یعرضون علیھا غدوا وعشیا ویوم تقوم الساعۃ ادخلوا آل فرعون اشد العذاب

"یعنی قوم فرعون کو صبح شام آگ کا مزہ چکھایا جاتا ہے اور وہ قیامت کے روز شدید ترین عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

برزخ اور قیامت کے عذاب کا تقابل ملاحظہ ہو پھر قوم نوح کے متعلق ارشاد ہے۔

اُغرقوا فادخلوا نارا۔ یعنی انہیں پانی میں غرق کیا گیا اور ساتھ ہی آگ میں داخل کر دیا گیا اور ساتھ ہی آگ میں داخل کر دیا گیا۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہیں اول یہ کہ غرق ہوتے ہی عذاب شروع ہوگیا۔ اور وہ بھی آگ کا البتہ دانشوروں کو تعجب ضرور ہوگا

کر غرق ہوئے پانی میں اور داخل کئے گئے آگ میں یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ پانی میں آگ تو کبھی کسی نے نہیں دیکھی پانی تو آگ کو بجھا دیتا ہے۔ مگر اپنی آنکھوں کی جگہ اگر اللہ کی قدرت پر یقین اور اس کی بات پر اعتماد ہو تو بظاہر اس تضاد کے باوجود بات ماننے میں تردد نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مشرک تو موت کے بعد فوراً برزخی عذاب میں گرفتار ہو گیا تو اہل یورپ اس قدر با اختیار کیونکر بن گئے کہ ان گرفتارِ بلا روحوں کو جب چاہیں بلا لیں۔ ذرا اہل یورپ سے کہئے کہ جو ملزم گورنمنٹ کی جوڈیشل حوالات میں بند ہے اُسے اپنی مرضی سے ذرا بلا کے تو دکھیں۔ آپ کہیں گے حکومت کے سامنے کسی کا کیا بس چل سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اللہ کی حکومت ہی ایسی کمزور حکومت ہے کہ اس کی جوڈیشل حوالات میں جو روحیں بند ہیں اہل یورپ انہیں بس ایک اشارے سے وہاں سے نکال کر اپنے سامنے حاضر کر لیتے ہیں۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ سفید فام اہل یورپ نے جو کہدیا مشرقی کالے لوگ انکار کی تاب کہاں سے لائیں اہل یورپ کی اس بے تکی بات کا انکار کرنے کے لئے کسی بڑے علم کی ضرورت نہیں صرف کامن سنس ہی کافی ہے۔ قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کا بدن بالذات مکلف ہے اور روح بالتبع یا بالعرض اور وہ پوشیدہ ہے اس لئے دنیا میں بدن انسانی پر ہی تکلیف آتی ہے یا اسے سزا ملتی ہے حضرت داؤد کی اُمت کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ وجعلنا منھم القردۃ والخنازیر یعنی ان کی جسمانی شکل بدل گئی۔ بندر اور سؤر بن گئے ان کے اندر روح انسانی موجود تھا جو متاثر بالتبع تھا اس میں عقل تھی اس لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ جوڑتے تھے۔

برزخ میں مکلف بالذات روح ہوتی ہے وہاں عذاب یا سزا بالذات روح کو ملتی ہے بدن کو بالتبع ملتی ہے جب روح نظر نہیں آتی تو اس کی سزا کیسے نظر آئے گی روح کی شکل بندر یا خنزیر کی بن جائے تو نظر کیونکر آئے۔

(ب) "اہل یورپ روحوں کا فوٹو لیتے ہیں"

انسان بھی عجب مجموعۂ اضداد ہے انکار پر اُتر آئے تو حقائق کی نفی کرنے میں باک نہ سمجھے ماننے پر آجائے تو توہمات کو حقائق قرار دینے میں عار نہ محسوس کرے۔

حضرت! آپ نے اتنا تو سوچا ہوتا کہ فوٹو مادی چیز کا لیا جاتا ہے اور روح لطیف شے ہے کیا اہل یورپ ہوا کا فوٹو لیتے ہیں یہ تو ریح ہے

روح بھی نہیں کیا خوشبو کا فوٹو لیتے ہیں
صاحب! ایک طرف آپ کی تحقیق کا یہ عالم کہ اہلِ فن جسے اجماعی عقیدہ تسلیم کرتے ہیں اس کے ماننے میں آپ کو تردد ہے دوسری طرف تقلید اور وہ بھی کورانہ کا یہ عالم کہ آپ اسے حقیقت نفس الامری سمجھے بیٹھے ہیں کہ اہلِ یورپ روحوں کا فوٹو لیتے ہیں اہلِ یورپ کا یہ ڈھکوسلا ہے اور آپ ذہنی مرعوبیت کا شکار ہیں۔

ج۔ "گو وہ مشرک ہیں مگر کسی قسم کے عذاب میں نہیں"۔
مگر یہ تو بتایئے کہ اگر مشرک عذاب میں نہیں تو کیا عذابِ الٰہی اہلِ ایمان کے لئے مقرر ہے؟ ابھی ابھی آپ کو قرآن کریم کی ایک آیت کی نشاندہی کی جا چکی ہے کہ اغرقوا فادخلوا نارا۔ تو ادخلوا کا مطلب کیا یہ ہے کہ وہ شاداں و فرحاں مٹک مٹک کر آگ کو تر و تازہ کرنے کے لئے جا رہے ہیں یا یہ مطلب کہ انہیں گھسیٹ کر گرفتار کر کے آگ میں ڈالا دھکیلا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ملزم ہیں گرفتار ہیں مقید ہیں تو اول ان کا آنا ہی بعید از قیاس ہے پھر یہ کیونکر معلوم ہوا کہ انہیں کسی قسم کا عذاب نہیں ہو رہا۔ یہ بس نری خوش فہمی ہے

د۔ "وہاں ان کے مراتب میں فرق ہے"۔
مراتب تو عزت میں ہوا کرتے ہیں سزا میں مراتب کا کیا مطلب۔ چلئے آپ کی مراد شاید یہ ہوگی کہ عذاب میں کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے فرق ہے۔ مگر اس فرق کا اندازہ یا تو احساس کے ذریعہ ہو سکتا ہے یا کسی کے بتانے سے احساس تو صرف اسے ہو سکتا ہے جسے عذاب ہو رہا ہے لہٰذا آپ کو احساس سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ رہا بتانے کا معاملہ تو کسی اہل یورپ ہی نے بتایا ہوگا مگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ یورپ کو یہ کیونکر معلوم ہوا۔ ظاہر ہے کہ محض ڈھکوسلا ہے۔

(ہ) "سائنسی مشاہدات کا انکار کیونکر ممکن ہے"
بات درست ہے مگر یہاں بات مشاہدے کی نہیں بلکہ راوی پر اعتماد کی بات ہے یہ صحیح ہے کہ کسی چیز کا مشاہدہ ہوا مگر اس کا کیا ثبوت کہ وہ چیز روح ہے ظاہر ہے کہ یہ مشاہدہ بلکہ مشاہدہ کرنے والے کا بیان ہے۔
اس دعوے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سائنس خود اپنے مشاہدات کا انکار کئے چلی جا رہی ہے اگر آپ کو یقین نہ آئے تو انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی سائنس کے بنیادی نظریات کا مقابلہ کر کے دیکھیں آپ کو سائنس کے مشاہدات

کے انکار کی حقیقت معلوم ہو جائے گی انیسویں صدی اور ابتدائی بیسویں صدی میں سائنس کا یہ مسلمہ عقیدہ تھا جو مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا کہ مادہ نہ فنا ہوتا ہے نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے صرف شکل بدلتا ہے نیوٹن کی اس تحقیق پر اہل سائنس کو یہاں تک غرہ تھا کہ قیامت کے انکار کے لئے یہی عقیدہ بنیاد اور ثبوت کا کام دیتی رہی مگر آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے سائنس کے مشاہدات کا یہ سارا تانا بانا ہی تار تار کر کے رکھ دیا اور مشاہدات کی بنا پر دعویٰ کر دیا کہ "انرجی کین بی کنورٹڈ ان ٹو میٹر اور میٹر کین بی کنورٹڈ ان ٹو انرجی" پھر ایک مشاہدے کی بنا پر ایک نیا اصول قائم کیا گیا جسے "سیکنڈ لا آف تھرموڈینامکس"

کہتے ہیں اب سائنس نے اپنے مشاہدات کی بنا پر کہنا شروع کر دیا کہ سورج "اویلے بل انرجی" روز بروز کم ہو رہی ہے ایک دن آئے گا کہ یہ بالکل ختم ہو جائے گا اور یہ سارا انتظام ختم ہو جائے گا۔ اب بتائیے آپ نے نیوٹن کے عہد کی سائنس کے مشاہدات کا انکار کیوں کر دیا ؟ صرف اس لیے کہ نئے مشاہدات سامنے آ گئے تو معلوم ہوا کہ محض مشاہدات کی بنا پر عقائد کی تعمیر نہایت بودا اور غیر عقلی موقف ہے یہاں تو

مشاہدے کی نہیں ایمان کی ضرورت ہے اور اصطلاح شرع میں "خبر رسول ؐ کو رسول ؐ کے اعتماد پر یقینی طور پر مان لینے کا نام ایمان ہے"۔

عذاب و ثواب قبر عالم برزخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ عالم حواس خمسہ کی زد سے باہر ہے اور سائنس کا تمام کاروبار ان معلومات سے متعلق ہے جو حواس مہیا کرتے ہیں جب وہ عالم سائنس کے دائرۂ عمل سے ہی باہر ہے تو اس عالم جیسے مسائل میں سائنس کو اتھارٹی تسلیم کرنا کہاں کی عقل مندی ہے سائنس اور دین کا اپنا اپنا وظیفہ ہے سائنس کا کام تلاش حقیقت ہے اور دین کا کام بیان حقیقت ہے تلاش میں یہ ضروری نہیں کہ مطلوبہ چیز یقیناً مل جائے۔ اس لئے عذاب و ثواب قبر کے لئے "ایکسپرٹ اپینین" درکار ہے اور وہ اللہ کا رسول ہے جو اس فن کا واحد ماہر ہے ہاں نور نبوت کی روشنی میں صوفیہ اکرام پر اس کے راز کھل سکتے ہیں اسی کو صوفیہ کشف الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ نور کسی ماہر فن کے پاس زیر تربیت رہ کر حاصل ہوتا ہے جسے شیخ کامل کہتے ہیں جس طرح روح کا مادی آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں اسی طرح روح کی کلام مادی کانوں سے سننا بھی ممکن نہیں۔ اہل یورپ کی جرأت کی داد دینا پڑتی ہے جو مادی کانوں سے روح کی کلام سن لیتے ہیں۔

سائنس کے مشاہدات کا جب انکار نہیں کیا جا سکتا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اہل یورپ کس کو حاضر کرتے ہیں؟ اس کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ذہن میں یہ حقیقت مستحضر کر لیجیے کہ روح لطیف ہے نہ یہ دکھائی دیتی ہے نہ اس کا فوٹو لیا جا سکتا ہے پھر روح اپنی مرضی سے اور چیزوں کی شکل میں متشکل بھی نہیں ہو سکتی۔ پس یہ نتیجہ نکلا کہ اہل یورپ جس چیز کو حاضر کرتے ہیں وہ ایسی مخلوق ہے جو اپنی مرضی سے دوسری چیز کی صورت میں متشکل ہو سکتی ہے اور اس مخلوق کا نام شیطان اور ہمزاد۔

زمانہ قبل اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے آپ کو کاہنوں کا وجود ملے گا۔ یہی مخلوق یعنی شیطان اور ہمزاد ان کاہنوں کے پاس آکر ان سے باتیں کرتی اور انہیں خبریں پہنچاتی تھی۔ ہمزاد ہمیشہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اس کی زندگی کے پورے حالات جانتا ہے۔ مگر آپ فرماتے ہیں "یہ نظریہ کوئی ٹھوس نہیں" مگر ٹھوس ہونے کا معیار کیا ہے؟ اسے پرکھنے کا پیمانہ کونسا ہے؟ اگر معیار یہی ہے اہل یورپ ٹھوس کہیں تو ٹھوس ورنہ پادر ہوا تو یہ نری عقیدتمندی ہے ٹھوس ہونے کی دلیل نہیں ہمارے نزدیک ٹھوس وہ ہے جسے اللہ اور رسول ٹھوس قرار دیں ارشاد باری ہے ھل انبئکم علی من تنزل الشیاطین الخ سورۃ الشعراء آیت ۲۲۱ تا ۲۲۳

"یعنی کیا میں تمہیں بتلاؤں کس پر شیطان نازل ہوتے ہیں؟ اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر۔ لا ڈالتے ہیں سنی ہوئی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں"

اس آیت سے واضح ہے کہ شیاطین کی کلام جو وہ انسانوں کے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ اس میں الفاظ ہوتے ہیں اس لئے مادی کان اسے سن لیتے ہیں ورنہ روح کی کلام نقطی نہیں ہوتی بلکہ نفسی ہوتی ہے۔ اس کلام کو سننے کا آلہ قلب ہے یہ کان نہیں اور شیاطین دوسری چیزوں کی صورت میں متشکل ہو سکتے ہیں انہی شیاطین کے مختلف نام ہیں مثلاً جن، ارواح خبیثہ، اور ہمزاد۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیاطین کا کلام سننے کے لئے آفاک اور اثیم ہونا ضروری ہے اور چونکہ اہل یورپ میں یہ کوالیفیکیشن بدرجہ اتم موجود ہے اس لئے ان کے ہاں یہ کاروبار زوروں پر ہے۔

ہمزاد کے متعلق شارحین حدیث نے بزبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا ہے۔

مشکوٰۃ باب الوسوسہ

عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما منکم احد الا وقد وکل بہ قرینہ من الجن وقرینہ من الملائکۃ

یعنی حضور اکرمؐ نے فرمایا ہر انسان کے ساتھ اس کا ایک ساتھی ہے جنوں سے ایک ساتھی ہے ملائکہ سے۔ اور اشعۃ اللمعات ۱: ۸۷ پر ہے

" آنکہ بتحقیق گماشتہ شدہ است بروے قرین و مصاحب وے از جنیاں و در بعض روایات آمدہ است کہ زائیدہ نمی شود آدمی زادرا فرزندے مگر آنکہ زائیدہ می شود از جن مانند آں و وے را ہمزاد وے میگوئند۔"

" یعنی حقیقی بات یہ ہے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک شیطان مقرر کر دیا جاتا ہے اور ایک فرشتہ، بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ انسان کا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اس کے ہمراہ ایک شیطان بھی اس کی مانند پیدا کیا جاتا ہے اور اس شیطان کو ہمزاد کہتے ہیں۔"

قرآن کریم میں انسان کے اس ساتھی کا مکالمہ جو قیامت میں ہوگا بیان ہوا ہے۔

قال تعالیٰ قال قرینہٗ قال ابن عباس و مجاھد وقتادہ وغیرھم ھو الشیطان الذی وکل بہ

" قرآن میں لفظ قرین میں قرین (ساتھی) جو آیا ہے اس کے متعلق ابن عباس قتادہ اور مجاہد اور دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ یہ قرین وہی شیطان ہے جو انسان کے ساتھ مقرر ہوا"

شیطان کی انسان کے ساتھ رفاقت کی ایک اور وجہ کی قرآن کریم نے نشاندہی فرمائی ہے۔

ارشاد ہے ومن یعش عن ذکر الرحمٰن تا بئس القرین (الزخرف ۳۶ تا ۳۸)

" اور جو کوئی آنکھیں چرائے رحمٰن کی یاد سے اس پر ہم ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں اور یہ رہتا ہے اس کا ساتھی اور وہ (شیطان) اسے راہ سے روکتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے رہتے ہیں ہم راہ پر ہیں حتیٰ کہ جب ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا کاش میرے اور میرے درمیان اتنی دوری ہوتی جتنی مشرق اور مغرب میں ہے۔ ہائے تو کتنا برا ساتھی ہے۔"

ان آیات سے معلوم ہوا کہ شیطان انسان کا ساتھی بھی بن جاتا ہے اس سے بات چیت بھی کرتا ہے، خبریں بھی دیتا ہے۔

ایک صورت اور بھی ہوتی ہے کہ شیطان کی بات سنائی دیتی ہے مگر وہ نظر نہیں آتا جیسے نسیم الریاض ۳: ۲۷۳)

وکانت الشیاطین ھی التی تسمعھم الکلام من غیر ان یروھم

" یہ وہ شیطان تھے جو اپنے متبوع کو کلام سناتے تھے مگر انہیں دکھائی نہیں دیتے تھے"

یہ صورت اس وقت پیش آتی تھی جب شیطان کسی مرئی صورت میں متشکل نہیں ہوتا تھا مگر اس کا کلام لفظی ہوتا تھا اس لئے متبوع کو سنائی دیتا تھا شیطان کاہنوں کو خبریں دیا کرتے تھے اس کا ثبوت تاریخ میں متعدد جگہ ملتا ہے مثلاً نبی کریمؐ کی مدینہ میں

آمد کی اطلاع ایک کاہنہ نے دی جس کا نام فاطمہ بنت نعمان نجاریہ تھا اس کے شیطان نے اسے یہ اطلاع دی تھی امام بیہقی حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں قال فکان اول خبر قدم المدینۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان امرأۃ من اھل المدینۃ کان لھا تابع من الجن فجاء بصورۃ طائر حتی وقع علی حائط دارھا فقالت لہ المرأۃ انزل تخبرنا ونخبرک قال لا انہ بعث بمکۃ نبی منع منا القرار وحرم علینا الزناء

"یعنی مدینہ میں حضور اکرم کے متعلق سب سے پہلے جس نے خبر دی وہ ایک عورت تھی ایک جن اس کے تابع تھا وہ ایک پرندے کی صورت میں اس کے گھر کی دیوار پر بیٹھ گیا عورت نے بلایا کہنے لگا نہیں آتا کیونکہ مکہ میں ایک نبی مبعوث ہو چکا ہے اس نے ہم پر زنا حرام کر دیا ہے"

یہ واقعہ آکام المرجان، نسیم الریاض ۳: ۲۷۳ ابن ندیم ص ۳۱۲ - روض الانف اور سیرۃ ابن ہشام میں بھی مذکور ہے۔

جن کا پرندہ کی شکل میں آنا اور کاہنہ کا اسے پہچان لینا ظاہر کرتا ہے کہ جن یا ہمزاد جب کسی ایسی مرئی شکل میں متشکل ہو تو نظر آتا ہے۔

ایک اور مشہور واقعہ آکام المرجان فی احکام الجان ص ۱۳۵ پر حضرت ابو موسیٰ اشعری گورنر بصرہ کے متعلق بیان ہوا ہے۔

عن سالم بن عبد اللہ قال ابطأ خبر عمر علی ابی موسی فاتی امرأۃ فی بطنھا شیطان فجاء فسالھا عنہ فقالت حتی یجیئ شیطانی فجاء فسالتہ عنہ قال ترکتہ مؤتزرا بکساء یھنأ ابل الصدقۃ

"گورنر بصرہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس امیر المومنین عمر فاروق رض کے پہنچنے میں دیر ہو گئی تو گورنر ایک کاہنہ عورت کے پاس آئے جس کے پاس شیطان آتا تھا اس سے پوچھا کہ عمر رض کہاں ہیں اور یہاں پہنچنے میں کیوں دیر ہو گئی عورت نے کہا میرا شیطان آجائے تو اس سے پوچھوں چنانچہ جب شیطان آیا اس نے پوچھا تو شیطان نے کہا میں نے عمر رض کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ گدڑی لپیٹ رکھی ہے اور صدقہ کے اونٹوں کا معائنہ کر رہے ہیں"

معلوم ہوا کہ کاہن اور بدکار قسم کے لوگوں کے ساتھ شیاطین کی راہ و رسم ہوتی ہے اور شکلیں بدل بدل کر ان آدمیوں کے پاس آتے ہیں بات چیت کرتے ہیں۔ خبریں دیتے ہیں۔ ہمزاد بھی یہی شیطان ہوتے ہیں آدمی کے مرنے سے اس کا ہمزاد نہیں مرتا۔ اس کو آدمی کے سارے حالات معلوم ہوتے ہیں اس کا کلام لفظی ہوتا ہے وہ مختلف شکلیں بدل لیتا ہے اہل یورپ ہوں یا اہل مشرق اگر باتیں سنتے ہیں تو ان شیطانوں کی اور فوٹو لیتے ہیں تو ان بہروپیے شیطانوں کے۔ روح تو لطیف شے ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کے اس واقعہ کے ضمن
میں آکام المرجان میں گورنر مصر کا جن سے ایک
اور مطالبہ کا ذکر بھی ہے۔

قالوا اذھب فاخبرونا عن امیرالمومنین
ما نتذاث علینا فقال ان ذالک الرجل ما
نستطیع ان ندنوا عنه بین عینیه روح
القدس وما خلق الله شیطانا یسمع صوته
الآخر بوجهه

دوسری روایت ہے وذالک لا یراہ شیطان
یمخرہ الملک بین یدیه وروح القدس
ینطق بلسانه

"یعنی حضرت ابوموسیٰ اور ان کے ساتھیوں نے
کہا کہ ہمیں یہ اطلاع لادے کہ امیرالمومنینؓ نے
یہاں آنے میں کیوں تاخیر کی وہ کہنے لگا میں یہ
نہیں بتا سکتا کیونکہ عمرؓ وہ شخص ہے کہ ہم اس
کے قریب جانے کی طاقت نہیں رکھتے اس کی
آنکھوں کے درمیان روح القدس ہے اور اللہ
نے کوئی ایسا شیطان پیدا نہیں کیا جس نے
اگر عمرؓ کی آواز سن لی ہو تو منہ کے بل گر گیا ہو"

"دوسری روایت کہ فرشتہ اس کے آگے ہوتا ہے
اور اس کی زبان پر جبرئیلؑ امین بولتا ہے"

(عینی شرح بخاری ۱۸ : ۲۶ پر اسود عنسی کا
واقعہ درج ہے جو یمن کا کاہن تھا پھر نبوت
کا دعویٰ کر دیا تھا۔

وعن قصته ان الاسود کان له شیطانان
یقال لاحدھما سحیق والآخرة شقیق
وکانا یخبرانه بکل شیئ یحدث من
امور الناس وکان باذان عامل النبی
صلی اللہ علیہ وسلم بصنعاء فمات
فجاء شیطان الاسود فاخبرہ فخرج
معه قومه حتی ملک صنعاء وتزوج
المرزبانة زوجة باذان ۔۔۔۔۔

قال وکان علی باب الاسود الف حارس
فنقب فیروز و دازدیه وغیرھما حتی
دخلوا علی اسود وقد سقته المرزبانة
الخمر حتی سکر فقتله فیروز وخرج راسه
واخرجوا المرأة وما احبوا من المتاع
وارسلوا الخبر الی المدینة۔

"اسود عنسی کا قصہ یوں ہے کہ اس کے
پاس دو شیطان تھے ایک کا نام سحیق دوسرے
کا شقیق تھا یہ دونوں اسے لوگوں کے حالات
بتاتے اور وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا جب
حضور اکرمؐ کا گورنر باذان صنعاء میں فوت ہوا
تو ان شیطانوں نے اسود کو اطلاع دی اسود
جمعیت لے کر صنعاء پہنچا قبضہ کر لیا اور باذان
کی بیوی مرزبانہ کے ساتھ نکاح کر لیا ۔۔۔"

"اسود کے دروازے پر ایک ہزار پہرہ دار
ہوتا تھا فیروز ویلمی دازویہ اور دوسرے صحابہ
نقب لگا کر اس کے محل میں داخل ہوئے مرزبانہ
نے اسود کو شراب پلا رکھی تھی وہ نشے میں دھت تھا

فیروز نے اس کا سر قلم کر دیا اور یہ لوگ مرزبانہ اور پسندیدہ سامان لے کر وہاں سے نکلے اور اسود کے قتل کی خبر مدینہ بھیجی۔"

اسی طرح عبدالقادر بغدادی نے اپنی کتاب "المعتبر" اور امام رازی نے اپنی تفسیر کی آٹھویں جلد کاہنہ بغدادیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ ۳۰ برس تک بغداد میں خبریں دیتی رہی جو اکثر صحیح ہوتی تھیں آخر اس کاہنہ کو سنجرین مالک شاہ خراسان نے اپنے ہاں منتقل کر لیا تھا۔

اسی طرح رشق اور سطیح دو مشہور کاہن تھے ان دونوں نے بھی نبی کریم ؐ کی بعثت کی خبر دی تھی۔ سواد بن قارب مشہور کاہن تھا اس کو اپنے ہمزاد نے تین دن مسلسل خبر دی تھی کہ نبی آخر الزماں مبعوث ہو چکا ہے۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ:۔

۱۔ ہمزاد یا شیطان اپنے قرین یعنی انسان کے تمام حالات سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔

۲۔ یہ جس شکل میں چاہے متشکل ہو سکتا ہے

۳۔ بات چیت کرتا ہے جو آدمی سن سکتا ہے کیونکہ اس کا کلام لفظی ہوتا ہے

۴۔ نظر آ سکتا ہے اگر مرئی شکل میں متشکل ہو۔ ارواح پر نہ کسی کا بس چلتا ہے نہ وہ کسی کے مطیع ہوتے ہیں نہ روح کی کلام لفظی ہوتی ہے کہ مادی کان سن لیں نہ وہ جسم کثیف ہوتا ہے کہ اس کا فوٹو لیا جا سکے۔

علامہ بیونی مصری نے یہ مکمل بحث اپنی مشہور تصنیف "کتاب الروح" میں لکھی ہے۔

۶۔ آپ نے فرمایا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ غیر معروف حضرات غوث ہوں اور عظیم اولیاء قطب، غوث اور قطب مناصب اولیاء ہیں منازل اولیاء نہیں اور اگر مناصب کی تقسیم کا مدار صرف شہرت ہو تو واقعی ایسا نہیں ہو سکتا مگر آپ نے یہ معیار کہاں سے اخذ کیا ہے یا کس نے آپ کو بتایا ہے کہ غوث اسی کو بنایا جائے گا جو معروف ہو اور غیر معروف کو لازماً قطب بنایا جائے گا۔ جب اللہ و رسول نے یہ معیار مقرر نہیں فرمایا اور اہل فن نے اس کی کہیں تخصیص نہیں کی تو آپ کیوں پریشان ہونے لگے؟

اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں ہے کہ آپ کو اللہ میاں سے شکایت ہو کہ ہمارے مشورہ کے بغیر ایسے فیصلے کیوں کر دیا کرتا ہے؟

دیکھئے تدبیر کائنات کا کام تدبیر کائنات کسی مخلوق کے مشورہ کے بغیر کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ دنیا کے ظاہری نظام میں آپ نہیں دیکھتے کہ مناصب کی تقسیم اللہ تعالیٰ کے اپنے اختیار میں ہے اکبر جیسے ٹھیٹ ان پڑھ کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہ بنا دیا اور پورے برعظیم کے علماء و فلاسفر اور فن کار منہ دیکھتے رہ جائیں آپ نے ماضی قریب میں یہ نہیں دیکھا بڑے بڑے باکمال لوگ موجود ہیں مگر اللہ تعالیٰ ایک غیر معروف میٹرک پاس کو صوبے کا

گورنر بنا دیا ہے۔

آپ نے تاریخ اسلام میں یہ نہیں پڑھا کہ حضور اکرمؐ نے ایک غیر معروف نوجوان کو جسے لوگ غلام زادہ سمجھتے ہیں سپہ سالار بنا دیا اور خلفائے راشدین اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کو اس کی زیر کمان جہاد کرنے کا حکم دیا۔ اب اگر آپ فرمائیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عمرؓ فاروق جیسے لوگ موجود ہوں اور ایک غیر معروف نوجوان کو سب پر حاکم بنا دیا جائے تو اس کا جواب وہی ہے جو قرآن نے بتا دیا ہے کہ اھم یقسمون رحمت ربک۔

پھر آپ نے جو فرمایا "عظیم اولیا" تو فرمائیے کہ اولیاءؒ کی عظمت کو ناپنے کا پیمانہ کونسا ہے؟ ولایت تو اس تعلق خاص کا نام ہے جو اللہ کے بندے کو اپنے رب کے ساتھ ہوا کرتا ہے اس تعلق کی بنا پر اللہ اپنے بندوں کو نوازنے کے لئے دو قسم کا انعام دیا کرتا ہے کسی کو مقامات اور منازل سلوک عطا کر دے، کسی کو کوئی منصب دے دیا دونوں چیزیں دیتا وہی ہے، مادشما یہ چیزیں تقسیم نہیں کیا کرتے اس لئے یہ کہنا ہی بے محل ہے بلکہ جرأت رندانہ ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ "لاکھوں اولیاء اور داتا صاحب کے مزار پر چلہ کشی کیوں کی"، یہاں آپ پر شاعرانہ مبالغہ کا رنگ غالب آگیا۔ اچھا یہ فرمائیے کہ

۱۔ ان "لاکھوں" اولیاء اللہ نے کیا داتا صاحب کو صرف غوث سمجھ کر چلہ کشی کی یا محض ولی اللہ سمجھ کر اخذ فیض کے لئے مراقب رہے ہیں؟

۲۔ اگر آپ کا دعویٰ یہی ہے کہ غوث سمجھ کر کرتے رہے تو اس کا ثبوت پیش کیجئے۔

۳۔ یہ لاکھوں کی تعداد آپ نے کہاں سے اخذ کی ذرا ان لاکھوں سے ایک سو اولیاء اللہ کے نام ہی بتا دیں۔

حضرت لاہوریؒ نے بس اتنی بات فرمائی تھی کہ قلعہ میں جو دفن ہیں ان کا نام بھی علی ہجویریؒ ہے اور داتا صاحب کا نام بھی علی ہجویریؒ ہے فرق یہ ہے کہ وہ غوث ہیں یہ قطب ہیں۔

حضرت لاہوریؒ کو تو اللہ تعالیٰ نے چشم بصیرت عطا کی تھی جس کی مدد سے انہوں نے اس کا مشاہدہ کر کے بتا دیا۔ اب فرمائیں کہ آپ کے پاس وہ کونسا آلہ ہے جس کی مدد سے آپ نے ان کی بات کو مردود قرار دیا اور اپنی بات منوانے پر مصر ہیں۔

ایک الیکٹریشن اگر وولٹ میٹر سے چیک کر کے بتا دیتا ہے کہ یہاں اتنی وولٹیج کی کرنٹ جا رہی ہے اگر ایک گنوار یا ایک وکیل کہنے لگے بالکل غلط ہے یہاں یہ وولٹیج کیسے جا سکتی ہے تو آپ کیا کہیں گے یہی نا! کہ الیکٹریشن کی بات وزنی ہے کیونکہ وہ صاحب فن ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے میٹر میں کوئی نقص ہو گنوار یا وکیل کی بات کا تو کوئی وزن نہیں یہ فن کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔

۷۔ آپ نے فرمایا "اگرچہ آپ نے درست طور پر صاحب جواہر القرآن پر تنقید کی مگر مولوی حسین علی صاحب ان کے استاد کے آپ

بھی قائل ہیں۔"

مولوی حسین علی صاحب کا استاد ہونا کوئی ایسا جُرم نہیں ہے کہ غلطی اُن کا شاگرد کرے اور تنقید کا نشانہ استاد کو بنایا جائے۔"

مولوی غلام اللہ خان پر تنقید کسی مخالفت کی بنا پر نہیں کی بلکہ ان کی اصلاح ان کے پیروکاروں کی اصلاح اور انہیں آخرت کی رسوائی سے بچانے کی ایک کوشش ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مقصد نہیں

۸۔ آپ فرماتے ہیں "آپ لوگوں کے کشوف میں اتنا تضاد کیوں ہے۔"

گذشتہ صفحات میں آچکا ہے کہ کشف ظنی چیز ہے دلیل شرعی نہیں۔ کشف میں غلطی کی وجہ دراصل تعبیر میں غلطی ہوتی ہے۔ کشف والہام کوڈ لینگویج ہوتی ہے اس کو ڈی کوڈ کرتے میں صاحب کشف کو غلطی لگ سکتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بے خیالی میں کوڈ لینگویج کو پلین لینگویج سمجھ لیا جاتا ہے اس وجہ سے تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔

آپ چونکہ کورٹ سے متعلق ہیں اس لئے یہاں آپ سے ایک سوال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ فرمائیے کہ ملک کا قانون ایک ہے مگر ہوتا یہ ہے، کہ سیشن کورٹ سے ایک ملزم کو پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے۔ ہائی کورٹ اسے بری کر دیتا ہے آپ نے کبھی یہ شکایت کی یا کبھی زیر لب بھی کہا کہ ججوں کے فیصلوں میں بڑا ہی تضاد ہے۔ لہٰذا یہ تمام عدالتیں بند کر دینی چاہئیں۔ یہاں تو آپ بڑی معصومیت سے کہہ دیتے ہیں کہ ہر جج کی اپنی نگاہ ہے اپنی اپنی تعبیر ہے مگر کشف میں تضاد آپ کو کیوں کھلتا ہے یہاں وزن کے باٹ کیوں بدل جاتے ہیں۔

اس دور کی بہت بڑی بیماری یہ ہے کہ معلومات کو علم کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ علم کی شان یہ ہے کہ وہ حقیقت شناس بنا دے بہر حال اس وہمی علم کا حال یہ ہے کہ اس میں وسعت یعنی طول و عرض بے پناہ ہے مگر عمیق یعنی گہرائی نام کو بھی نہیں چنانچہ اس "علم" کو ذرا سا کرید دیں تو نیچے سے جہالت نمودار ہو جاتی ہے ستم بالائے ستم یہ کہ اس جہالت کو "علم" کہنے بلکہ منوانے پر اصرار بھی ہوتا ہے۔

ایک بات جس کا ذکر آپ نے سب سے پہلے کیا ایک خاص وجہ سے اس کا ذکر سب سے آخر میں کرتا ہوں۔ "آپ فرماتے ہیں عملاً صفر ہوں" مگر کتب ہائے تصوف متعلقہ سلاسل متفرقہ بشمول یوگ رہبانیت و علوم باطنی یہود و نصاریٰ وغیرہ کا مطالعہ شوق سے کرتا رہتا ہوں۔"

آپ کی اصل بیماری یہ ہے کہ آپ ایک فن یعنی عملی چیز صرف فلسفہ سمجھ کر مطالعہ کر رہے ہیں اور ذہنی کشتی کے داؤ پیچ سیکھنے پر توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ سارا زور تھیوری پہ اور پریکٹیکل میں صفر ہونے کے باوجود اعتراض ان لوگوں پہ ہے جنہوں نے پریکٹیکل میں عمریں کھپا دیں ہیں اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا نکل سکتا ہے کہ "جیک آف آل ٹریڈز ماسٹر آف نن"

اس روش کا ایک اور نتیجہ وہ ہے جس کی نشاندہی مولانا روم نے

کی ہے کہ مرغ پر نارستہ چوں پراں شود ✽ طعمۂ ہر گربۂ دراں شود

لہذا مشورہ یہ ہے کہ اس صفر کے وسیع دائرے سے نکل کر عملی دنیا میں قدم رکھنے کی کوشش کریں ؎

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر ✽ کہ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

(والسلام)

نعت

نذر صابری

کلی کلی کی زباں پر یہ نام کس کا ہے؟
نسیم صبح بتا! فیضِ عام کس کا ہے؟

زمانہ گیسو و رخ ان کے دیکھ کر بولا
"یہ شام کس کی یہ ماہِ تمام کس کا ہے"؟

قمر اشارے سے شق، مہر حکم سے واپس
کوئی بتائے کہ یہ احترام کس کا ہے؟

مقام سدرہ پہ شرما کے رہ گئے جبرئیلؑ
ورائے عرش معلّیٰ اخرام کس کا ہے؟

عتاب میں بھی رہا رنگ پیار کا ورنہ
وہ آزمائیں تو بچ جائے کام کس کا ہے؟

غروب مہر نہیں ملک ماہ و انجم میں
نہیں تو نور یہ بالائی بام کس کا ہے؟

بیان نام چہ حاجت ای قاصد پہ سلام
کہ خود پیام کہے گا پیام کس کا ہے؟

کہا یہ نذر سے شرما کے حور نے یارب
نظر نہ ہم سے ملائے غلام کس کا ہے؟

معارف القرآن

اللہ کے نزدیک مقبولیت کا ایک معیار

اس معیار کے دو جز ہیں۔ ان میں سے ایک بھی خلل آجائے تو ساری کوششیں اکارت اور ضائع ہو جاتی ہیں اگر غور کیا جائے تو دنیا میں جہاں کہیں کوئی گمراہی یا غلط کاری ہے وہ انہی دو اجزاء میں سے کسی ایک جزو کے خلل سے پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں موازنہ کریں یا خود مسلمانوں کے فرقوں، جماعتوں اور پارٹیوں میں مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہی دو نقطے ہیں جن میں سے ایک ہٹ جانا انسان کو ذلت اور ضلالت کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔

"یعنی اس شخص سے بہتر کسی کا طریقہ نہیں ہو سکتا جس میں دو باتیں پائی جائیں ایک اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ یعنی اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کردے ریاکاری اور دنیا سازی کے لئے نہیں بلکہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالےٰ کو راضی کرنے کے لئے عمل کرے"

دوسرے وھو محسنٌ یعنی وہ عمل بھی درست طریقہ پر کرے امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ درست طریقہ پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل محض خود ساختہ طرز پر نہ ہو بلکہ شریعت مطہرہ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک اخلاص دوسرے عمل کا درست یعنی مطابق شریعت وسنت ہونا ان میں سے پہلی شرط اخلاص کا تعلق باطن یعنی قلب سے ہے اور دوسری شرط یعنی موافقت شرع کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے جب یہ دونوں شرطیں کسی شخص نے پوری کر لیں تو اس کا ظاہر و باطن درست ہوگیا۔ اور جب ان میں سے کوئی شرط مفقود ہوگی تو عمل فاسد ہوگیا۔ اخلاص نہ رہا تو عملی منافق ہوگیا۔ اور اتباع شریعت نہ رہی تو گمراہ ہوگیا۔ تو عمل کہاں مقبول ہوگا۔

پہلی شرط یعنی اخلاص کی ضرورت اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں عمل کا بے کار ہونا تو عام طور پر سب سمجھتے ہیں لیکن حسن عمل یعنی اتباع شریعت کی شرط پر بہت سے مسلمان بھی دھیان نہیں دیتے یوں سمجھتے ہیں کہ نیک عمل کو جس طرح چاہو کر لو حالانکہ قرآن وسنت نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ حسن عمل صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اتباع سنت پر موقوف ہے اس سے کم کرنا بھی جرم ہے اور اس سے بڑھانا بھی جرم ہے جس طرح ظہر کی چار کی بجائے تین رکعات پڑھنا جرم ہے اسی طرح پانچ پڑھنا بھی ویسا ہی جرم اور گناہ یہ ہے کسی عبادت میں جو شرط اللہ تعالے اور اس کے رسول نے لگائی ہو اس میں اپنی طرف سے شرطوں کا اضافہ یا آپ کی بتلائی ہوئی شکل سے مختلف صورت اختیار کرنا یہ سب ناجائز اور حسن عمل کے خلاف ہے خواہ دیکھنے میں وہ کتنے ہی خوب صورت اور پرمزیدار عمل نظر آئیں۔ بدعات اور محدثات جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گمراہی قرار دیا اور ان سے بچنے کی تاکیدی ہدایتیں فرمائیں وہ سب اسی قسم سے ہیں جاہل آدمی (ایسے ایجاد بندہ طرز کے) کام کو پورے اخلاص کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی اور عبادت وثواب جان کر کرتے ہیں مگر شرع محمدی میں اس کا یہ عمل ضائع بلکہ موجب گناہ ہوتا ہے (کیونکہ خلاف سنت ہوتا ہے)

اسی وجہ سے

قرآن کریم نے بار بار حسن عمل یعنی اتباع سنت کی تاکید فرمائی ہے

سورۃ ملک میں لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا فرمایا۔ اکثر عملاً نہیں فرمایا یعنی کثرت عمل کا ذکر نہیں بلکہ حسن عمل کا ذکر ہے اور حسن عمل وہی ہے جو سنت رسول کے مطابق ہو۔

خلاصہ یہ کہ ہمارا جو عمل سنت کے طریقے سے ہٹے گا نامقبول ہوگا۔ نماز، روزہ حج زکوٰۃ صدقات خیرات ذکر اور درود وسلام (تہوار وتقریبات) سب میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے

● قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے کہیں توڑتا ہے۔

جو لوگ حق پر ہوں
ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے
اور جو باطل
پر ہوں ان کے ساتھ فصل کا حکم ہے

(ا۔ع۔ ت)

کمالاتِ اشرفیہ

صُحبتے با اہل دل

● ۔ فرمایا کہ حق تعالےٰ تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے کہ اخلاقِ رذیلہ جاتے رہیں ۔ حمیدہ پیدا ہو جائیں معاصی چھوٹ جائیں ۔ طاعت کی توفیق ہو جائے غفلت من اللہ جاتی رہے اور توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے ۔

● ۔ اصل چیز اصلاح کے لئے صحبت ہے علم چاہے ہو یا نہ ہو ۔ بلکہ علم بھی بلا صحبت کے بے کار ہے "صاحب صحبت بلا علم" کی اصلاح زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت صاحب علم بلا صحبت کے .... صحابہؓ سب کے سب عالم نہ تھے صرف صحبت سے پایا جو کچھ پایا اور ہمیشہ اہل اللہ نے صحبت ہی کا التزام رکھا ۔ اتنی توجہ علم کی طرف نہیں کی جتنی صحبت کی طرف کی ۔

● ۔ بیعت کی حقیقت ہے اعتقاد جازم اپنے تعلیم کرنے والے پر یعنی اس کو یہ یقین ہو کہ یہ میرا خیر خواہ ہے اور جو مشورہ دے گا وہ میرے لئے نہایت نافع ہوگا ۔ غرض اس پر پورا اطمینان ہو اور اپنی رائے کو اس کی تجویز و تشخیص میں مطلق دخل نہ دے ۔ بیعت کا خاصہ یہ ہے کہ جانبین میں ایک تعلق خاص پیدا ہو جاتا ہے شیخ سمجھتا ہے یہ ہمارا ہے اور مرید سمجھتا ہے یہ ہمارے ہیں ڈانواں ڈول حالت نہیں رہتی ۔

● ۔ اگر ثمرات کی بھی تمنا ہو تب بھی ثمرات پر نظر نہ کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ ثمرات حاصل ہوتے ہیں یکسوئی سے اور جب ثمرات کے ورود کی جانب متوجہ رہا تو یکسوئی کہاں رہی ۔ ذہین اور ذکی آدمی کو کیفیات وغیرہ نہیں ہوتیں کیونکہ اس کا ذہن ہمیشہ چلتا رہتا ہے اس کو یکسوئی ہوتی ہی نہیں اور بلا یکسوئی کے کوئی کیفیت ہو نہیں سکتی اسی وجہ سے عاقل شخص کو کیفیات بہت کم ہوتی ہیں برخلاف اس کے جن میں عقل کا مادہ کم ہوتا ہے ان کو کشف وغیرہ کیفیات بہت ہوتی ہیں ۔

● ۔ دو چیزیں اہل علم کے واسطے بہت ہی بُری ہیں حرص اور کبر ۔ یہ ان میں بالکل نہیں ہونا چاہیئے

● ۔ اس اعتراض کا ذکر تھا کہ "اسلام زور شمشیر پھیلا" فرمایا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رح نے خوب لطیف

جواب دیا تھا کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا تو ہم پوچھتے ہیں کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آئے تھے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک دو شمشیر زن تو بزور شمشیر اسلام نہیں پھیلا سکتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ شمشیر زنی اصل علت اشاعت اسلام کی نہیں۔ بلکہ اصل علت اور ہی ہے جس سے شمشیر زن پیدا ہو کہ وہ حقیقت میں قوتائید حق ہے اور ظاہری سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں۔

● ۔ ذکر و شغل کے دو ثمرات ہیں ایک تو رضا جو اصل ثمرہ ہے اس کا ظہور تو آخرت میں ہوگا اور ایک ثمرہ دنیا میں حاصل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ قلب کو ایک خاص لگاؤ حق تعالیٰ کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ عاشق کے قلب کو معشوق کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑی چیز احکام کی پابندی ہے۔

● ۔ بزرگوں میں یہ بات دیکھنا چاہیئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے انہیں کتنا حصہ ملا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ حضور اکرمؐ سے کس درجے کی مناسبت ہے اور مناسبت بھی بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ یوں دو چار دن کو تو سب بن سکتے ہیں۔

● ۔ ذکر میں چاہے دل لگے یا نہ لگے لیکن برابر کیئے جاؤ رفتہ رفتہ اس کی عادت پڑ جاتی ہے کہ پھر بغیر اس کے چین نہیں پڑتا۔ ذکر الٰہی کا نفع تو شروع ہی سے ہونے لگتا ہے لیکن محسوس نہیں ہوتا جیسے بچہ روز بروز کچھ بڑھتا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ آج اتنا بڑھا کل اتنا بڑھا البتہ ایک معتد بہ مدت گزر جانے کے بعد اس کی پچھلی حالت کو خیال میں لا کر موازنہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہو۔ یہی حال ذکر کا ہے شروع میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ بھی نفع نہیں ہو رہا حالانکہ نفع برابر ہو رہا ہے۔ پتھر پر پہلے اول قطرہ گرتا ہے پھر دوسرا یہاں تک کہ پانی گرتے گرتے اس میں گڑھا پیدا ہو جاتا ہے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ آخری قطرہ نے وہ گڑھا پیدا کر دیا ہرگز نہیں بلکہ گڑھا کرنے میں اول قطرہ کو بھی ایسا ہی دخل ہے جیسا کہ آخری قطرے کو اول قطرے کو بے اثر ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے۔

● ۔ مختلف اذکار سے اس قدر نفع نہیں ہوتا جس قدر ایک یا دو قسم کے ذکر سے ہوتا ہے کیونکہ مختلف اذکار میں طبیعت منتشر رہتی ہے کوئی ذکر بھی راسخ نہیں ہوتا ایک دو اذکار پر مداومت کی جائے تو وہ بہت جلد راسخ ہو جاتے ہیں

● ۔ رضا اصل مطلوب ہے اگر ذوق شوق نہ ہو نہ سہی۔

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ

ابو سعید ایم۔اے

شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی شخصیت اہل علم اور اہل معرفت کے نزدیک جانی پہچانی ہے۔ آپ نے اذکار و اشغال تصوف پر ایک مستقل کتاب ضیاء القلوب فارسی زبان میں لکھی اور تصفیۃ القلوب کے نام سے اس کا ترجمہ اردو میں لکھا گیا۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف بیان فرماتے ہیں :۔

"حافظ محمد یوسف نے مجھ سے کہا اور اس امر کے محرک ہوئے کہ جو اذکار و اشغال اور مراقبات خاندان عالیہ چشتیہ صابریہ قدوسیہ کے معمول بہا ہیں وہ سب کے سب لکھے جائیں ... مجھے اپنے پیر و مرشد اور بزرگان خاندان سے جو کچھ اذکار و اشغال سلسلہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ کے پہنچے ہیں تحریر کرتا ہوں۔"

اس تمہید سے ظاہر ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے ذکر و شغل کے مختلف طریقے جو اس کتاب میں درج فرمائے ہیں وہ بزرگان خاندان کے معمول بہا ہیں یعنی مختلف سلسلوں میں ذکر و شغل کے یہ طریقے مدتہائے دراز سے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں چند طریقوں کی تفصیل حضرت حاجی صاحبؒ کے الفاظ میں دی جاتی ہے۔

(۱) پاس انفاس کا دوسرا طریق :۔

"یہ ہے کہ لفظ اللہ کو باہر کے سانس میں لائے اور ھُو کو اندر لے جائے اور ملاحظہ کرے کہ اندر باہر وہی ہے یعنی ھو الظاھر والباطن کا خیال رکھے اور اس ذکر کی اتنی کثرت کرے کہ سانس ذاکر ہو جائے اور ذکر میں مستغرق ہو اور ذکر حیات حاصل ہو سوتے جاگتے ذاکر رہے اور پاس انفاس سے بہرہ مند ہو اور ماسوائی اللہ سے دل پاک و صاف ہو جائے چونکہ یہ ذکر دل کو تمام کدورتوں سے پاک و صاف کرتا ہے اور تجلیات الٰہی کا مورد بناتا ہے اس لئے اس کو جاروب قلب کہتے ہیں۔"

۲۔ ذکر ارّہ کا دوسرا طریق :۔

"اول آنکھیں بند کر اور زبان کو تالو سے لگا کر الٹے سانس سے لفظ اللہ کو شدت کے ساتھ ناف سے کھینچ کر داہنے مونڈھے تک پہنچائے اور قوت سے ھُو کی ضرب دل پر لگائے جیسے بڑھئی لکڑی پر آرہ کھینچتا ہے۔ رہا دم نفس کو زور اور سخت آواز سے جاری رکھے اور صفات امہات کا ملاحظہ کرے اور تصور کرے کہ دل پر آرہ کھینچ رہا ہوں اور برادہ کی جگہ جو بڑھئی لکڑی کاٹتے ہوئے نکالتے ہیں۔ خیال کرے کہ نور کے ذرات دل سے نکلتے ہیں اور بدن میں منتشر ہو جاتے ہیں ... اس ذکر میں اتنا مشغول ہو کہ محویت کلی اور مشاہدہ حاصل ہو اور کیفیت اس ذکر کی کرنے والا خوب جانتا ہے لکھنے کی گنجائش نہیں (صفحہ ۲۲ مطبع مجتبائی طبع ۱۳۴۶ھ)

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

مجلسِ ذکر - ۸

پروفیسر حافظ عبدالرزاق صاحب ایم، اے

تصوف اور تعمیرِ سیرت

دائرہ محبت کے بعد مراقبہ اسم الظاہر والباطن کرایا جاتا ہے اللہ تعالےٰ کے یہ چار اسماء یا چار صفات علم و معرفت کے ارکان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

الاول والآخر والظاھر والباطن

اس مراقبہ کا وظیفہ یہی ہے۔

ھوالاول والآخر والظاھر والباطن

آپ اپنے متعلق سوچیں آپ کی ایک ابتداء ہے ایک انتہا ہے ایک ظاہر ہے ایک باطن ہے آپ پر ہی کیا موقوف ہے کائنات کی ہر چیز کی ایک ابتداء اور ایک انتہا ہے ایک ظاہر اور ایک باطن ہے مگر اللہ تعالےٰ کی صفت جو اول ہے تو اس سے مراد یہ ہے ہر ماسوی سے اول ہے اور صفت الآخر سے مراد یہ ہے کہ ہر ماسوی سے آخر ہے نہ اس کی اولیت کی کوئی حد ہے نہ اس کے آخر ہونے کی کوئی حد ہے اس کی ذات ہر ماسوی سے پہلے ہے اور ہر ماسوا کے بعد وہ باقی رہے گا اور صفت الظاہر یہ ہے کہ ہر شے پر غالب ہے اس سے اس کا غلبہ اور اس کی عظمت مراد ہے۔ اور ظاہر وہ ہوتا ہے جس نے باطن کا احاطہ کر رکھا ہوتا ہے تو الظاہر سے مراد یہ ہوئی کہ وہ ہر شے کو محیط ہے۔ الباطن سے مراد قرب ہے کہ ہر شے کی ذات سے بھی وہ اس کے زیادہ قریب ہے پس الاول سے اس کے قدم کا اظہار ہے اور الآخر سے اس کے دوام اور بقا کا اظہار ہے الظاہر سے اس کے علوشان اور عظمت مراد ہے اور الباطن سے اس کا قریب ہونا۔

الاول والآخر۔ دو صفات پر تدبر کرنے سے سالک پر یہ کھلتا ہے کہ مخلوق پیدا ہونے میں اس کی محتاج ہے زندہ رہنے میں اس کی محتاج ہے مخلوق کے لئے فنا ہے اس کا قیام عارضی ہے دل لگانے کی چیز نہیں الظاہر اور الباطن پر تفکر سے یہ کھلتا ہے کہ وہ اتنا ظاہر ہے کہ ہر چیز کا وجود اس کی ذات پر دلالت کرتا ہے ذرّے سے آفتاب تک ہر چیز کا وجود اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے بنانے والا پیدا کرنے والا۔ اسے زندہ رکھنے والا اسے فنا کرنے والا کوئی ضرور ہے ظاہر اتنا کہ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفتِ کردگار

الباطن ایسا کہ اس کی کنہہ اس کی حقیقت کو کوئی نہیں پا سکتا۔

علماء کے نزدیک یہ چار اسماء علم و معرفت کے ارکان ہیں اور اہل طریقت کے نزدیک اسم الظاہر والباطن سالک

گئے لئے دو بازو ہیں جن کی مدد سے سالک کی روح قرب الٰہی کی طرف پرواز کے قابل ہوتی ہے۔

اس مراقبہ کا مقتضی یہ ہے کہ سالک ماسویٰ سے فانی سے دل نہیں لگاتا اور اس کی محبت بڑھنے لگتی ہے جو باقی رہنے والا ہے پھر سالک کے اندر اخلاص کا جذبہ ترقی کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے لئے ہر باطن بھی ظاہر ہے ہر غیب میں شہود ہے ہر مخفی بھی نمایاں ہے اس لئے اس کے سامنے ظاہرداری۔ نمائش، تصنع اور بناوٹ نہیں چل سکتی اس کے ساتھ معاملہ کھرا رکھنا پڑے گا۔

پھر سالک کے اندر سے کبر اور خودبینی کا صفایا ہو جاتا ہے۔ اسے نہ اپنے علم پر ناز ہوتا ہے نہ اپنی معرفت پر غرہ مستعار اور عارضی چیز پہ بھلا کیونکر کوئی ناز کرے۔

پھر اسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے اندر سنسر کا محکمہ قائم ہو گیا ہے ایک (C. I. D) موجود ہے جو نہایت قریب سے اعمال کی صورت اور ان کے محرکات دل سے اٹھنے والے خیالات اور ارادوں سے بھی واقف ہے۔ اس وجہ سے اس کی عملی زندگی کا سارا نظام اس انداز سے بدلتا ہے کہ اس کے عمل کا محرک محبت الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے اس کے ہر فعل کی صورت رضائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے اور سالک خود اپنی ذات کے لئے اور معاشرے کے لئے ایک رحمت ثابت ہونے لگتا ہے

وہ نورانی دائرے جو مراقبات و دائرہ محبت سے لطیفۂ نفس کے سامنے محسوس ہوتے تھے اس مراقبے میں سالک کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نور نے سالک کے ظاہر اور باطن کو لپیٹ میں لے لیا ہے سالک کو اپنے اندر اور باہر نور ہی نور محسوس ہوتا ہے۔

اسم الظاہر اور اسم الباطن کے متعلق حضرت مجدد سرہندی رح لکھتے ہیں:۔

"اسم باطن کی سیر کے متعلق کیا لکھا جائے اس سیر کا حال استتار اور تبطن کے مناسب ہے البتہ اس مقام سے صرف اس قدر بیان کیا جاتا ہے کہ اسم الظاہر کی سیر صفات میں ہے بغیر اس بات کے کہ اس کے ضمن میں ذات ملحوظ ہو اور اسم الباطن کی سیر بھی اگرچہ اسماء میں ہے لیکن اس کے ضمن میں ذات ملحوظ ہے اور یہ اسماء ڈھالوں کی طرح ہیں جو حضرت ذات کے حجابات ہیں۔ مثلاً صفت علم میں ذات ملحوظ نہیں ہے لیکن اس کے اسم علیم میں پردہ صفت کے پیچھے ذات ملحوظ ہے کیونکہ علیم ایک ذات ہے جس کی صفت علم ہے پس علم کی سیر اسم الظاہر کی سیر ہے اور علیم کی سیر اسم الباطن کی سیر ہے باقی تمام اسماء و صفات کا حال اسی قیاس پر ہے۔"

مراقبۂ عبودیت:

اس مراقبہ کا وظیفہ ہے۔

والنجم والشجر یسجدان

سالک اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز ایک خاص مقررہ قانون تکوینی کے مطابق وجود میں

آتی قائم رہتی اور غائب ہوتی ہے جمادات کے لئے الگ قانون ہے سورج مقررہ وقت پر مشرق سے طلوع ہوتا ہے مقررہ وقت پر مغرب کی طرف جا کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے یہ کبھی نہیں ہوا کہ قانون تکوینی کی مخالفت کرکے اُلٹے رُخ چلنے لگے۔ چاند اپنے وقت پر ہلال دکھائی دیتا ہے اور مقرر وقت پہ بدر نظر آتا ہے یہ کبھی نہیں ہوا کہ پہلی کو بدر دکھائی دے اور چودھویں کو ہلال نظر آئے کُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ تمام اجرام فلکی مقررہ رُخ پہ مقررہ رفتار سے مقررہ مدار پر سرگرم سفر ہیں ان کی مجال نہیں کہ اس سے سرمو انحراف کر سکیں اسی طرح تمام جمادات، اطاعت و فرمانبرداری کا حق ادا کر رہے ہیں اور اپنے خالق کے سامنے سراپا نیاز بنے ہوئے ہیں۔

نباتات پر غور کرو۔ آم کے درخت پر کبھی مالٹے کا پھل نہیں لگتا چیل اور دیودار کی جڑ سے آم اور انار کی شاخیں نہیں پھوٹتیں۔ انگور کی بیل پر کبھی آم کے پتے نہیں لگتے نباتات کے لیے خالق نے جو احکام جاری کر دیے ہیں ان کی برابر تعمیل ہو رہی ہے کبھی نافرمانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حیوانات کو دیکھو ان کے لیے اپنا اپنا قانون مقرر ہے شیر بھوکا مر جائے گا لیکن گھاس نہیں کھائے گا اور بھیڑ بکری کبھی گوشت نہ کھائے گی۔ بھیڑ کے پیٹ سے بھیڑیا پیدا نہیں ہوتا اور بکری کے ہاں کبھی شیر کا بچہ پیدا نہیں ہوا۔ غرض ہر چیز کے لئے جو قانون تکوینی مقرر ہے وہ اس کی پوری پوری پابند ہے یہی مراد ہے النَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ سے۔

پھر یہاں سالک کو یہ غور کرنا ہوتا ہے کہ انسان بھی کائنات کی پوری مشینری کا ایک پرزہ ہے اور پرزہ بھی بڑا اہم ہے کہ اُسے اختیار دیا گیا چاہے اطاعت کرے چاہے بغاوت مگر قانون تکوینی میں یہ بھی پوری طرح پابند ہے کبھی بغاوت نہیں کر سکتا۔ ہاں قانون تشریعی میں اسے اختیار دیا گیا ہے یہی اختیار اس کے امتحان کا ذریعہ ہے اسی اختیار کی بدولت وہ اشرف المخلوقات ہے جب اس کائنات کی مشینری کے باقی پرزے یعنی جمادات نباتات حیوانات، ایک ہی سمت میں یعنی اطاعت کے رُخ پر حرکت کر رہے ہیں تو یہ پرزہ جسے انسان کہتے ہیں اگر مقررہ سمت سے ہٹ کر اُلٹے رخ یا غلط رُخ کی طرف حرکت کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ مشینری میں بگاڑ پیدا ہوگا سکون اُٹھ جائے گا اور سارے بگاڑ کی ذمہ داری انسان پہ ہوگی اس لئے سالک اس مقام پر پہنچ کر اسی نتیجہ پہ پہنچتا ہے کہ مشینری میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان بھی قانون کی پابندی اطاعت اور بندگی کا شیوہ اختیار کرے چنانچہ اس وقت سالک کی روح پکار اٹھتی ہے۔

سبحان ربی الاعلیٰ اور سر سجدے میں رکھ دیتا ہے۔

یہ الفاظ کیا ہے دو حقیقتوں کا اعتراف ہے۔

اوّل یہ کہ وہ ذات تمام نقائص اور ہر احتیاج سے پاک ہے جو اس ساری کائنات کا اور میرا رب ہے میں اس کے علو شان اور عظمت کا اعتراف کرتا ہوں دوسرا یہ کہ جہاں تک اس ذات کے ساتھ میرا تعلق ہے

میں سراپا احتیاج ہوں۔ عاجز ہوں اپنا بندگی ہی میرا نصیب ہے اور میں اپنی عاجزی اور اس کی عظمت دونوں کا اظہار کرتے ہوئے اس کے سامنے سربسجود ہوتا ہوں اور سالک یہ حقیقت پالیتا ہے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔

اس مراقبہ کا مقتضی یہ ہے کہ سالک جب اپنے مقام یعنی عبودیت سے آشنا ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی اور زندگی کا ہر پہلو اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ میں اسی کا بندہ اسی کا مطیع اسی کا فرمان بردار ہوں میں زندگی کے ہر معاملے میں اس کی مدد اس کی حفاظت اور اس کی توفیق کا محتاج ہوں اور جب یہ آواز اس کے کانوں تک پہنچتی ہے کہ واعبد ربک حتیٰ یأتیک الیقین۔

تو اس کی اطاعت شعاری کا اعتراف اور اس کی عبادت و بندگی کا عمل وقتی اور عارضی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے کہ مرتے دم تک اسی بندگی کی روش پر قائم رہوں گا۔

جب پوری زندگی اپنے رب کی اطاعت میں لگا دینے کا عزم اور جذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ میرے ذمے جو ڈیوٹی لگائی گئی ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ اس لئے بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے دونوں پہلوؤں میں اس کی بندگی اور اطاعت کا عمل دخل ہو اب وہ جہاں یہ دیکھتا ہے کہ رب کے ساتھ میرا معاملہ کھرا ہے وہاں یہ بھی سوچتا ہے کہ مخلوق کے ساتھ میرے معاملات درست ہوں یہ سوچ اسے ترک دنیا اور رہبانیت پر مجبور کرے گی۔ اسے معاشرے کا مفید ترین فرد بن کر زندہ رہنے پر مجبور کرے گی جو کوئی داخلی یا خارجی قوت اسے بے راہ کرنے پر آمادہ کرے گی۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلے گا۔

سبحان ربی الاعلیٰ

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں عبودیت کا مدار دو چیزوں پہ ہے۔ حُبِّ تام اور عجزِ کامل۔

اس مراقبے میں سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ رب العٰلمین کے سامنے سربسجود ہے شجر حجر حیوان انسان، ملائکہ جن سب اپنا اپنا سر سجدہ میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک خاص کیفیت ہوتی ہے اور کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو حقیقت سے بالعموم بُعد ہی ہوتا ہے ذاق من ذاق۔

مراقبۂ فنا و بقاء

اس مراقبہ کا وظیفہ ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

مراقبہ عبودیت میں سالک محسوس کرتا ہے کہ یہ عظیم کائنات اس کی ہر چیز اس وحدہٗ لاشریک کے سامنے سربسجود ہے اور سبحان ربی الاعلیٰ کی ایک گونج سنائی دے رہی ہے مراقبۂ فنا میں سالک محسوس کرتا ہے کہ ہر چیز غائب ہوگئی شجر حجر حیوان انسان کچھ بھی موجود نہیں بلکہ سالک کو اپنے وجود کا احساس بھی نہیں رہتا یہ فنا کی کیفیت ہے مگر ہر سالک کی تفصیل کیفیت مختلف ہوتی ہے پھر جب سالک اس کے دوسرے حصے میں

تفکر کرتا ہے اور اس میں ڈوب جاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ کائنات میں اگر کچھ ہے تو اسی ذات وحدہٗ لاشریک کے تجلیات و انوار کا فیضان ہے یہ کیفیت مراقبۂ بقاء کی ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ کیفیت کا کما حقہٗ بیان ممکن ہی نہیں آپ نے شہد اور اس ذائقہ کی کیفیت کسی ایسے آدمی کے سامنے پیش کریں جس نے شہد دیکھا ہو نہ چکھا ہو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے بیان کو سن کر وہ شہد کی حقیقت اور اس کے ذائقے کو کما حقہٗ سمجھ لے گا۔ آپ اپنا زور کلام صرف کر کے اسے زیادہ سے زیادہ حقیقت کے قریب لا سکتے ہیں مگر اس کیفیت کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے اسی طرح خوشی یا غم کی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ مگر اس کیفیت کی حقیقت بیان میں نہیں آسکتی۔

فناء و بقا و سالک کی دو کیفیتیں ہیں جب انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا گیا تو دو فلسفے وجود میں آگئے یعنی وحدت الوجود اور وحدت الشہود پہلے نظریے کا غلبہ زیادہ ذہنوں پر رہا پھر باہم تکرار اور مباحثے ہوئے مگر کیفیات میں استدلال کیا خدمت انجام دے سکتا ہے۔

ہر آں معنی کہ شد از ذوق پیدا
کجا تعبیر لفظی باید او را

بات اتنی ہے کہ سالک نے فناء کے مراقبے میں یہ محسوس کیا کہ کائنات کی ہر چیز فنا ہو گئی ہے اور مراقبہ بقا میں محسوس کیا کہ بقاء صرف اس ذات اقدس کو ہے جس کے انوار و تجلیات سے کائنات بہرہ ہے اور ان کے بغیر کچھ نہیں۔

اگر اس کیفیت کو استدلال کے دائرے میں ہی گھسیٹ کر لایا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہی حاصل ہوتا ہے حقیقی وجود صرف واجب کا ہے ممکن اپنے وجود میں واجب کا محتاج ہے اور محتاج کا ہونا نہ ہونا برابر۔ اس لئے موجود حقیقی صرف واجب ہے مگر ممکن بھی معدوم نہیں بلکہ اس کے مقابلہ میں کالمعدوم ہے۔

حضرت مجددؒ فرماتے ہیں:

فنا بقا شہودی ہے وجودی نہیں کیونکہ بندہ فنا نہیں ہوتا نہ ہی حق تعالےٰ کے ساتھ متحد ہوتا ہے بندہ ہمیشہ بندہ ہے اور خدا ہمیشہ خدا ہے وہ لوگ غلط ہیں جو کہتے ہیں کہ بندہ اپنے وجودی تعینات کو رفع کر کے اپنی اصل کے ساتھ جو کہ تعینات و قیود سے پاک ہے متحد ہو جاتا ہے اور اپنے آپ سے فانی ہو کر اپنے رب کے ساتھ بقاء حاصل کر لیتا ہے جیسے قطرہ اپنے آپ سے فانی ہو کر دریا سے مل جاتا ہے اور اپنی قید کو رفع کر کے مطلق کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے اعاذنا اللہ سبحانہ من معتقداتھم السوء

فنا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ماسوی اللہ کو بھول جائے اور حق تعالےٰ کے سوا کسی اور کی گرفتاری نہ رہے سینہ و دل کا میدان اپنی تمام مرادوں اور خواہشوں سے پاک و صاف ہو جائے جیسا کہ مقام بندگی کے مناسب ہے اور مقام بقا کے مناسب یہ ہے کہ انفسی آیات کے مشاہدہ کے بعد بندہ اپنے مولیٰ جل شانہٗ کی مرادوں پر قائم رہے اور حق تعالےٰ کی مرادوں کو عین اپنی مرادیں معلوم کرے

(مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۹۹)

(از مولانا تھانویؒ ملخصاً)

"فنا کا اثر یہ ہے کہ معاصی اور نامرضیات کے متعلق تقاضائے نفس فنا ہو جائے۔ جب تک نفس کا تقاضا فنا نہیں ہوتا وہ فضولیات اور شہوات میں فنا کرتا رہتا ہے"

معاصی کی طرف بالکلیہ میلان جاتا رہنا ضروری نہیں اور آسان بھی نہیں البتہ نفس کا تقاضا کھونے کی ضرورت ہے۔ فنا سے پہلے معصیت کی طرف سے نگاہ کا روکنا مشکل تھا۔ اب معصیت کا قصد نہیں ہوتا یعنی کوئی منظر سامنے آجائے تو سر نیچا ہو جاتا ہے۔ اس کا نام مقام فنا ہے۔

بقاء

فنا میں حال کا غلبہ ہوتا ہے۔ بقا میں آکر وہ حال مغلوب ہو جاتا ہے اور سکون ہو جاتا ہے اور وہ حالت مبتدی کی سی ہوتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ پہلے خالی تھا اب پُر ہو گیا پہلے فیض خود لیتا تھا اب اس سے دوسرے کو فیض پہنچے گا۔"

اس مراقبہ کے راسخ ہو جانے کا زندگی پر یہ خوشگوار اثر پڑتا ہے کہ اصولِ تجویز سے انسان کلیتہً دست بردار ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی کا رہنما اصول، اصولِ تفویض ہو جاتا ہے۔

فنا و بقاء کی بحث کرتے ہوئے انکشاف میں مولانا تھانویؒ اس کی حقیقت اور زندگی پر اس کے اثرات بیان کرتے ہیں۔

فنا دو قسم ہے فنا واقعی اور فنائے علمی فنائے واقعی اور فنائے علمی۔ فنائے واقعی یہ ہے کہ افعال ذمیمہ اور ملکاتِ رذیہ زائل ہو جائیں مثلاً ظاہری معاصی چھوٹ جائیں قلب سے حُبِ غیر اللہ، حرص، طول امل، کبر، عجب اور ریا وغیرہ سب نکل جائیں اس کو فنائے واقعی اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے جو چیز زائل ہوتی ہے یعنی افعال و ملکات رذیہ وہ واقع میں بھی فنا ہو گئے اس کو اصطلاحاً فنائے حسی یا فنائے حسی بھی کہتے ہیں۔

فنائے علمی یہ ہے کہ غیر اللہ اس کے قلب سے مرتبۂ علم میں نکل گیا یعنی اس کو غیر اللہ کے ساتھ تعلق علمی نہ رہا بایں معنی کہ جیسا التفات و استحضار غیر کا پہلے تھا وہ نہ رہا بلکہ ملکہ یاد داشت کا راسخ ہو گیا اور غیر سے ذہول ہو گیا جیسا محبتِ مجازی میں بھی غلبہ کے وقت ایسا ہی ہوتا ہے کہ محبوب دل میں زیادہ بسا رہتا ہے غیر کی طرف کسی بڑی ہی ضرورت سے توجہ ہوتی ہے ورنہ گنجائش نہیں ہوتی۔

پھر اس کے مراتب حسب استعداد سالک مختلف ہوتے ہیں حتیٰ کہ کسی کو استغراق محض ہو جاتا ہے کسی پر سکر غالب ہوتا ہے کوئی مجذوب محض ہو جاتا ہے کوئی پھر بعض احوال کی تکمیل کے لئے یا دوسروں کی تکمیل کے لئے علم بالاشیاء کی طرف عود کر آتا ہے اس آخری حالت کو بقا کہتے ہیں۔

"قسم اول کا فائدہ ظاہر ہے کہ مضرات شرعیہ کا ترک ہے جس کو تقویٰ کہنا چاہیئے اور قسم ثانی کا فائدہ یہ ہے کہ یہی علم بالاشیاء بعض اوقات مفضی الی المعاصی ہو جاتا ہے پس اسباب بعیدہ سے بچنا تقویٰ کا کمال ہے۔"

اس سلسلے میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے نظریۂ فنا اور عقیدہ صحو کا اجمالی بیان خالی از فائدہ نہیں ہوگا۔

"فنا کی تین منزلیں ہیں پہلی منزل فنائے صفات وخصائص ذاتی اوصاف طبعی ہے تاکہ بندہ اتباع شریعت میں اپنی خواہشات کی بجائے اللہ کی مرضی پر عامل ہو سکے اور نفس امارہ کی خواہشوں کو فنا کر کے احکام خداوندی پر عمل کر سکے۔"

دوسری منزل یہ ہے کہ بندہ لذات حسی سے کنارہ کش ہو جائے یہاں تک کہ جب وہ اتباع شریعت کرے تو اس پر کسی فخر و مباہات کا اظہار بھی نہ کرے فنا کی یہ منزل ذہنی اور باطنی زندگی سے متعلق ہے تیسری منزل یہ ہے کہ شعور بھی فنا ہو جائے کہ مجھے خدا کی حضوری حاصل ہے اس حالت میں اگرچہ مادی جسم باقی رہتا ہے مگر شخصیت فنا ہو جاتی ہے۔ فنا کی اس آخری منزل پر پہنچ کر سالک باقی باللہ کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یعنی بقا باللہ، فنا فی اللہ کا ثمرہ ہے اس بقا باللہ کی حالت میں بھی سالک ذات باری کا ادراک نہیں کر سکتا وہ خدا کے ساتھ تو ہے مگر خدا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اس حالت میں بھی بندہ بندہ ہی رہتا ہے خدا وراء الوریٰ ہے کوئی بندہ کنہ ایزدی سے آگاہ نہیں ہو سکتا نہ خدا کے ساتھ متحد ہو سکتا ہے۔

نظریہ فنا سالک کی آخری منزل نہیں اگر سالک جذب یا سکر سے مغلوب ہو جائے تو اسے بہت نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ وہ ان فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ جو معاشرے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اللہ اپنے بندے سے اس بات کا بھی طالب ہے کہ وہ جس سوسائٹی میں رہتا ہے اس کے حقوق و فرائض پوری توجہ سے ادا کرے جب بندہ فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ کے مقام کو حاصل کر لیتا ہے تو وہ حالت سکر سے حالت صحو میں واپس آ جاتا ہے اور فنا کے بعد پھر انسانی یا انفرادی صفات اختیار کر لیتا ہے اور چونکہ اس کی شخصیت میں صفات ایزدی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے اس لئے وہ دوسرے ہم جنسوں کے لئے اسوہ (نمونہ) بن جاتا ہے یعنی وہ اپنے اعمال سے دوسروں کو یہ سبق دیتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح صحیح معنوں میں شریعت کا اتباع کریں۔

(ملخصاً از رسائل جنیدؒ بحوالہ تاریخ تصوف)

گویا اس مراقبہ کا تقاضا یہ ہے کہ سالک اپنے ارادہ کو اپنی پسند کو فنا کر دے اللہ کا ارادہ اور اس کی پسند باقی رہ جائے سالک کی پسند اللہ کی پسند کے تحت ہو جائے یہی وہ صورت ہے جس کی نشاندہی حدیث نبوی میں کی گئی ہے کہ

ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بھا ورجلہ التی یمشی بھا (بخاری)

"اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں اور جب میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کی سماعت ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو لیتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے" مراد یہ ہے کہ سالک کے تمام اعضا اللہ تعالیٰ کے ارادے اور پسند کے تحت حرکت کرنے لگتے ہیں۔

پروگرام ماہانہ مجلس ذکر سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

نام شہر	دن	مقام	وقت
لاہور	پہلا جمعہ	مسجد نور داروغہ والا رد واہگہ روڈ	بعد نماز جمعہ
راولپنڈی	تیسری جمعرات	مدرسہ انوار العلوم مسجد چراغ حسین شاہ بنی چوک	بعد نماز مغرب
اسلام آباد	آخری جمعرات	مسجد الفقراء آبپارہ	بعد نماز مغرب
میانوالی	دوسرا جمعہ	صوفی دواخانہ بلوخیل روڈ	قبل نماز جمعہ
گجرات	آخری جمعہ	کوٹھی امان اللہ لک صاحب کچہری روڈ	گیارہ بجے تا بارہ بجے دن
شاہ کوٹ	آخری جمعہ	جامع مسجد غلہ منڈی	بعد نماز جمعہ
سیالکوٹ	پہلا جمعہ	۱۲۲/ تاندا غلام کچا روڈ چھاؤنی	۱۰ بجے دن
فیصل آباد	پہلی جمعرات	6/A پیپلز کالونی	بعد نماز مغرب
ملتان	تیسرا جمعہ	مسجد سٹیشن ہیڈکوارٹر چھاؤنی	بعد نماز جمعہ
اٹک	ہفتہ	مسجد گورنمنٹ کالج	بعد نماز مغرب
سرگودھا	تیسرا جمعہ	مسجد بلاک نمبر ۲	۹½ بجے سے ½-۱۰ بجے تک صبح
جھنگ شہر	پہلا جمعہ	ٹھنڈی مسجد باب عمر رض	قبل از نماز جمعہ
جہلم	پہلا جمعہ	مسجد انٹر کالج جی ٹی روڈ	بعد نماز عصر
پشاور	تیسرا جمعہ	مسجد کمپنی باغ	۹ بجے سے ۱۲ بجے دن
ڈیرہ اسماعیل خان	دوسرا بدھ	جامع مسجد کلاں	بعد نماز مغرب
کوہاٹ	آخری جمعہ	عسکری مسجد چھاؤنی	۹ بجے سے ۱۰ بجے دن
ایبٹ آباد	پہلا جمعہ	مدرسہ تدریس القرآن کنج قدیم	بعد نماز جمعہ
کوئٹہ	پہلا جمعہ	مدرسہ تجوید القرآن بابو محلہ ریلوے کالونی	۱۰ بجے دن
مظفر آباد (آزاد کشمیر)	تیسرا جمعہ	جامع مسجد سول سیکرٹریٹ	بعد نماز مغرب

حافظ عبدالرزاق ایم اے

"خُدایا ایں کرم بارِ دگر کُن"

گذشتہ سے پیوستہ

پہلا عمرہ: تاثرات

یہاں سے جانے کے بعد روزمرہ کی عملی زندگی میں یہ گھر کہاں نظروں کے سامنے ہوگا۔ کہ آدمی یہی عہد دہراتا رہے ہاں یہ درست ہے مگر اس گھر کی معنوی اولاد امکانی صورت میں ہر شہر ہر گاؤں بلکہ محلہ میں نظر آتی ہے جہاں ایسے لوگ بستے ہیں جن کا رشتہ خواہ کسی درجہ میں ہو، اپنے خالق سے ہے کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارا ہر دن اسی عہد کے ساتھ اس گھر کی نمائندگی کرنے والی عمارت سے شروع ہو۔

الٰہی! تیری توفیق کے بغیر یہ کیسے ہو سکتا ہے دوسری بات جو سمجھ میں آئی وہ چکر لگانے سے متعلق ہے کہ پتھر کی ایک چوکور عمارت کے گرد انسانوں کا ہجوم گھوم رہا ہے آخر کیوں؟ یہ عمارت چشم ظاہر میں تو ایک مکان ہے جس کا کوئی مکین نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ توحید کا ایک انمٹ نشان ہے جسے

یعنی نماز تو آدم اور اس کی اولاد پر فرض کی گئی تھی جب اخلاف . نے نماز سے بیزاری اختیار کی اور خواہشات نفسانی کے بندے بن گئے تو گمراہ ہو کے تباہ ہوئے لہٰذا ظاہر ہے کہ نماز تو آدم سے فرض چلی آ رہی ہے اور نماز کے لیے قبلہ کا ہونا عقلی اعتبار سے بھی لازمی امر ہے لہٰذا یہ گھر تو اتنا پرانا ہے جتنا انسان پرانا ہے . اس حقیقت کا اعتراف تو باسورتھ سمتھ جیسے متعصب عیسائی نے محمد اور محمڈن ازم MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM میں کر دیا اور ولیم میور جیسے دشمن اسلام نے بھی LITF OF MOHAMMAD میں کر دیا ہے . بہر حال یہ توحید کا قدیم ترین اور اہم نشان ہے اور اس کے گرد چکر لگانا اس حقیقت کے اظہار کی ایک صورت ہے کہ طواف کرنے والا زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ آج جس طرح یہ میرا مادی جسم اس حسی اور ناسوتی مظہر توحید کے گرد چکر لگا رہا ہے اسی طرح عمر بھر میری امنگیں اور آرزوئیں میرے اعمال اور خیالات اس واحد مطلق کی رضا کے گرد گھومتے رہیں گے :

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

پھر یہ دیکھا کہ پہلے تین چکر یوں لگانے ہیں کہ سینہ ابھرا ہوا ہو قدم یوں اٹھیں جیسے یلغار ہو رہی ہے اور بازو یوں حرکت کریں جیسے پہلوان خم ٹھونک کے میدان میں اترتے ہیں اس کا پس منظر تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ خوب اکڑ کے چلو کہ دیکھنے والے یوں نہ کہیں کہ مدینے کی آب و ہوا نے اور مدینے کے بے جلنے والے نظریہ نے ان

لوگوں کو کمزور و لاغر اور مریل بنا دیا ہے اس لئے اپنی قوت کا اظہار اس انداز سے کرو۔ یعنی ایک "اکڑ" تو اللہ کو مطلق پسند نہیں مگر باطل کے سامنے اکڑنا بھی اللہ کو پسند ہے باطل کو مرعوب کرنا بھی اللہ کو پسند ہے۔ درست مگر اب نہ یہاں باطل کا کوئی نمائندہ یا نمائندہ جماعت یہ نظارہ دیکھ رہی ہے اور نہ یہاں موجود ہے پھر اس کی کیا ضرورت؟ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں کائنات کا معلم محسن اور مدبر بنانے کے لئے نبی کریم کی ذات کو انتخاب کیا۔ وہاں اس معلم کے شاگرد بھی ہر طرح کے ٹسٹ لے کے معاشرہ میں سے انتخاب کر لئے اور یہ شاگرد اللہ پاک کو ایسے محبوب ہیں کہ ان کی اداؤں کی نقل کرنا ہی عبادت قرار دیا اور ایسی عبادت کہ جس کے بغیر حج جیسی عظیم عبادت ہی ناقص رہ جاتی ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

یعنی حضور کے ان شاگردوں کی اتباع میں اپنی رضا کو محصور کر دیا اور ان کی اتباع کے صلے میں ان انعامات کا اعلان فرمایا جن کو فوز عظیم قرار دیا گیا:

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرّۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب

افسوس کہ ہم نے اپنے اسلاف کو کچھ اس طرح بھلا رکھا ہے جیسے ماضی سے کلیتہً کٹ چکے ہوں اس لئے یہ باتیں ہمیں جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے لئے بہت بڑا اور اہم ذریعہ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى

بارہا مٹانے کی کوشش کی گئی مگر وہ بار بار ابھرتا رہا۔ جب پہلا انسان کرۂ ارض پر آباد ہوا۔ اس نے یہ گھر بنایا کیونکہ اسے یہاں آباد کرنے والے نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ تاکہ اس کی اولاد کا رشتہ اپنے خالق سے قائم رہے اور ان کی توجہات کا ایک بادی مرکز ہو۔ اس کے جذبات محبت کا ایک حسی محور ہو اسے ایک مرکز پر جمع رکھنے کے لئے ایک صوری نشان ہو لوگ کہتے ہیں کہ یہ عمارت کوئی اتنی قدیم نہیں کیونکہ قرآن گواہ ہے کہ اللہ کے خلیل ابراہیم نے یہ مکان بنایا تھا۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ۔ انسان ٹھوکر کھانے لگے تو الفاظ سے معانی اخذ نہیں کرتا بلکہ الفاظ میں معانی داخل کرتا ہے اور وہ بھی اپنی پسند اپنی اپج کے مطابق۔ حالانکہ ان الفاظ سے ہی اس گھر کی قدامت کا اظہار ہوتا ہے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل نے اسکی بنیادوں پر دیواریں اٹھائیں وہ بنیادیں جو موجود تھیں مگر امتدادِ زمانہ سے ان کے نشان غائب ہو چکے تھے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خلیل اللہ نے یہ مرکز تعمیر کیا تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان سے پہلے بنی نوع انسان کو کبھی مرکز کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ اور اللہ نے جتنے پیغمبر بھیجے ان کی امتوں کو نماز پڑھنے کا نہ حکم دیا نہ فرض قرار دیا۔ مگر جس نے قرآن مجید پڑھا ہو وہ کیسے مانے کیونکہ یہاں تو ارشاد ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّیَّةِ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ الخ

آگے ارشاد ہوتا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ الخ